برسات محبت کی

شبینہ گل

شبینہ گل

برسات محبت کی

وہ اس کے لیے محبت تھی۔ سراپا محبت۔ سرما کی نرم گرم دھوپ جیسی' جو تن من کو نرم سی تپش سے پگھلا دے۔ جیسے مخمل سی گھاس' جس پر پاؤں دھرے سکون کا احساس اندر تک تراوٹ بخش دے۔ ایسی تھی اس کی محبت جیسے سخت گرمی میں لو کے تھپیڑوں کو دھکیل کر پھیل جانے والی ہلکی خنک ہوا جو اپنے سنگ بادلوں سے قطرے کھینچ لائے اور تپتی زمین پر پھوار کی صورت برسا دے۔ بس اسی پھوار جیسی ٹھنڈی' خوش گوار اور بھیگی بھیگی سی محبت اور اس کا تصور۔ جیسے کوئی چودھویں رات میں کھلے آسمان تلے شبنم میں رچی گھاس پہ ننگے پاؤں چلتا چاند کو تکتا من ہی من میں اس سے ہم کلام ہو۔ ایسے میں اس کے چہرے پہ پھیلی آسودگی اور طمانیت جیسا تھا اس کی محبت کا خیال' اس کا تصور۔ جیسے بہار میں چار سو کھلے رنگ برنگ پھول اور فضا میں گھلی ان کی ملی جلی مہک میں سے ہر پھول کی خوشبو الگ کرنا محال ہو' ایسے ہی اس کے لیے محال تھا یہ فیصلہ کرنا کہ وہ اس سے کیوں محبت کرتا تھا۔ وہ اس کے لیے گلاب کی ادھ کھلی کلی تھی۔ مگر..... کسی اور کے کوٹ میں سجی ہوئی.....

☼ ☼ ☼

بے حد متناسب' سانچے میں ڈھلا موم کی صورت سا سراپا' مناسب قد' دودھ اور میدے میں گلاب گھلی رنگت' پتلے پتلے دلکش نقوش' بے حد گھنے' ملائم' ریشمی' چمکدار شہد رنگی بال' شاعر کی تخلیق جیسے نازک ہاتھ پاؤں۔ چہرے پہ قوس قزح کی مانند بکھری معصومیت' تروتازگی اور شادابی۔ یہ اساور نجم جس کی خوب صورتی اور دلکشی پر اس کے اپنے ماں باپ بھی انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ ایک بار نہیں' بار بار' ہر بار جب وہ ان کے سامنے آتی تھی۔ ہر بار جب وہ مسکراتی تھی۔ انہیں لگتا تھا وہ آج اسے پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ اس پر مستزاد اس کی خوش اخلاقی۔ وہ بے حد خوش مزاج' خوش اطوار اور خوش گلو تھی۔ ایک ایسی نایاب لڑکی جس سے شاذ ہی کسی کو کوئی شکایت ہوتی تھی۔ وہ ہر دلعزیز تھی۔ اساور کے بعد دانش۔ اس سے دو برس چھوٹا تھا اور پھر بریرہ۔ اساور سے پورے دس برس چھوٹی۔ نقوش میں اساور کی ہو بہو کاپی' مگر رنگت قدرے دبتی ہوئی تھی۔ مزاجاً" شوخ و چنچل اور اپنی بجو کی دیوانی تھی۔ کون تھا جو اساور کا دیوانہ نا تھا۔ جہاں وہ ہوتی وہاں کسی کو کوئی اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ کوئی تو بات تھی اس میں کہ چاہ کر بھی کوئی اس سے حسد نہ کر پاتا تھا۔ اپنی ان خوبیوں پر وہ خود نازاں تھی یا مغرور' یہ اندازہ بھی کبھی کسی کو نہ ہو پاتا تھا۔

وہ بہت اعلا اخلاق کی حامل تھی' یہ بات بچہ بچہ جانتا تھا۔ اسکول' کالج' یونیورسٹی ہر جگہ وہ مشہور رہی تھی' لیکن اس کی شہرت ہمیشہ مثبت رہی' نیک نام رہی۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہر فنکشن میں بھرپور طریقے سے حصہ لینا اساور اپنا فرض سمجھتی تھی' ہر مقابلے میں انعام حاصل کرتی تھی' خواہ وہ پہلا ہو یا دوسرا' تیسرا۔ جوش و جذبہ اس کی فطرت میں بھرا تھا۔ لمحہ لمحہ زندگی سے خوشیاں کشید کرنا اس کا اضافی ہنر۔ وہ اچھی اسٹوڈنٹ رہی ہمیشہ۔ ٹاپ پوزیشن کے لیے کبھی ہلکان نہیں ہوئی اور چوتھی پوزیشن سے کبھی نیچے نہیں

گئی۔ وہ لٹریچر کی دیوانی تھی ' انگلش ہو یا اردو۔ ہر کتاب چاٹ جاتی۔ سو اس نے ماسٹرز کرنے کے لیے انگلش لٹریچر کو چنا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ اردو لٹریچر میں ماسٹرز کا تھا۔ اگر قسمت ساتھ دیتی تو اور قسمت نے اس کے لیے کیا لکھ رکھا تھا اگر وہ جان جاتی تو...

انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کے بعد اسے اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچررشپ آفر ہوئی تھی جو اس کے لیے اعزاز کی بات تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے یوں تھی گویا فلک کا سب سے درخشاں ستارہ اور اس کے گرد باقی سب جیسے سیارے ' جو اس کے وجود سے روشنی مستعار لیتے تھے تو جیتے تھے۔ سیاروں کا غرور کرنا بنتا نہیں اور ستارے کو غرور تھا نہیں۔ اس ستارے کو معلوم تھا کہ وہ خواہ کتنا بھی روشن ہو جائے ' ایک نہ ایک دن اسے بحکم الٰہی ٹوٹ کر مٹی میں مل جانا ہے۔ تو جب انت مٹی ہے تو غرور کیسا؟۔

تخلیق وہ رب کائنات کی تھی تو غرور بھی اسی پہ سجتا ہے۔ نہ کہ بندوں پہ۔ خدا کے علاوہ اگر کوئی غرور و تکبر کو اپنی صفت بنانے کی کوشش کرے تو وہ ملعون ٹھہرایا جاتا ہے۔ انسان یہ حقیقت جان کر بھی انجان بن جاتا ہے اور یہیں سے خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں سے دنیا کا بھی تو آغاز ہوا تھا۔ یعنی ابلیس کے غرور سے۔ آدم کے لیے اس کی نخوت سے۔ تو ازل سے کیا ہوا اپنا عہد ابلیس تا ابد نبھائے گا۔ نشانہ آدم و حوا ہی ہیں۔ مختلف روپ میں مختلف ادوار میں اور یہاں جو روپ تھا جو ٹارگٹ تھا وہ تھے نجم ظہیر اور آسیہ نجم۔ جی ہاں۔ اساور نجم کے والدین۔

بیٹی ہو الیسرا و قلوپطرہ، تو ماں باپ بھلا کس موقع پر اپنا غرور ظاہر کرتے ہیں؟ جی بالکل۔۔۔ جب بات آتی ہے مناسب رشتے کی۔ نجم صاحب کو کوئی بھی رشتہ اپنی شہزادی کے شایان شان نہ لگتا تھا۔ رشتے تو اس کے تب ہی آنا شروع ہو گئے تھے جب وہ محض میٹرک کی طالبہ تھی۔ بڑی نخوت و حقارت سے وہ جاننے والوں کو وہ رشتے بتادیا کرتے تھے یہ کہہ کہ۔

"ہمارے لیول کے مطابق تو نہیں ہیں وہ لوگ، آپ کہیں تو میں آپ کی بیٹی کے لیے کہہ دیتا ہوں۔ آپ کو سوٹ کرے گا وہ رشتہ۔" اور جو قناعت پسند ہوتے وہ قبول کر لیتے ورنہ منہ بنا کر ٹال جاتے۔ یوں کئی رشتے دوسری فیملیز میں ٹرانسفر ہوتے رہے اور نجم صاحب بیگم کے ساتھ مل کر مضحکہ اڑاتے رہے۔

"بھلا ہماری شہزادیوں جیسی بیٹی کے قابل تھا وہ لڑکا۔ ہماری اساور کے لیے تو ایسا لڑکا آئے گا کہ لوگ دنگ رہ جائیں گے۔" جس رشتے کا وہ مضحکہ اڑا رہے تھے وہ نجم صاحب کے دوست کے توسط سے آیا تھا۔ لڑکا اٹامک انرجی میں بہت اچھی پوسٹ پہ فائز تھا۔ اعلا تعلیم یافتہ اور خوب صورت تھا۔ مالی لحاظ سے بھی نجم صاحب کے ہم پلہ تھے۔ لیکن۔۔۔ اور یہ "لیکن" ہی تمام مسئلوں کی ابتدا ثابت ہوتا ہے۔ اب پتا نہیں یہ "لیکن" بذات خود مسئلہ ہے یا انسان ہی ہر سیدھی چیز کو مسئلہ بنانے کا شوقین ہے۔ بہرحال۔۔۔ نجم صاحب کے اعتراض کی وجہ ان کا کنبہ تھا۔ وہ لوگ چار بھائی چار بہنیں تھے۔ لڑکا سب سے بڑا تھا اور باقی بہن بھائی غیر شادی شدہ اور زیر تعلیم تھے۔ نجم صاحب کی بات سے متفق ہونے کے باوجود آسیہ بیگم کو لگا کسی نے ان کے دل پر چٹکی کاٹی ہے۔ وہ خود ایک مختصر خاندان سے تھیں۔ دو بھائیوں رؤف اور منور کی اکلوتی لاڈلی نازوں پلی بہن۔ جبکہ نجم صاحب کا خاندان کافی بڑا تھا۔ نجم صاحب سب سے بڑے تھے اور ان کے بعد بالترتیب دو بھائی ضیغم اور ارقم اور پھر چار بہنیں سعیدہ، شاہدہ سعدیہ اور نبیلہ۔ نجم صاحب نے بھی بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں ساری عمر نبھائی تھیں، لیکن بیوی تو پرائی بیٹی ہوتی ہے۔ اس کے لیے اصول و قواعد الگ ہوتے ہیں، لیکن بس نے جارہی تھیں۔ ایک بار پھر شوہر کے اعتراض سے متفق ہونے کے باوجود ان کا دل لہولہو ہوا تھا۔ آسیہ بیگم درد کو صبر کی مانند نگل گئیں۔ اپنے جیسی زندگی وہ بھی بیٹی کو نہیں دینا چاہتی تھیں۔

پھر اساور کی ایک یونیورسٹی فیلو نے اپنے بھائی کا رشتہ دیا۔ ان کا خاندان مختصر تھا۔ رہائش گاؤں کی تھی سو دونوں بہنیں تعلیم کی غرض سے شہر میں بھائی کے ساتھ رہتی تھیں۔ والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ اس نے یقین دہانی کروائی کہ بھائی نے شادی کر کے بیوی کو بھی ساتھ ہی رکھنا ہے۔ گاؤں نہیں بھیجنا۔

"اس کا بیک گراؤنڈ دیہاتی ہے۔ بے شک وہ اساور کو شہر میں رکھے، لیکن ہر غمی خوشی میں گاؤں کا ہی رخ کرنا پڑے گا۔ اساور کو ہم نے نازوں میں پالا ہے۔" نجم صاحب یہ اعتراض نکالتے ہوئے ایک بار پھر اپنی بیوی کو فراموش کر گئے تھے ــــــــ بس تو پھر۔۔۔ کوئی کالا اور موٹا تھا، کوئی صاحب جائیداد نہ تھا، کوئی کم پڑھا لکھا تھا، کسی کے سر پہ ذمہ داریوں کا انبار تھا، کوئی بہو کمانے والی مانگتا تھا اور کوئی۔۔۔ دین دار تھا۔

یوں نخرے دکھاتے دکھاتے کیڑے نکالتے نکالتے سالوں پہ سال گزرتے رہے۔ ان کے شاندار لاؤنج میں لگے کیلنڈر چینج ہوتے رہے نئے کیلنڈر لگ کر پرانے ردی میں جاتے رہے۔ اساور تعلیم مکمل کر کے

لیکچر شپ میں مصروف تھی' ساتھ ساتھ ایم اے اردو کی بھی تیاری کرتی رہی۔ جاب کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ماسٹرز کرلیا۔ گریڈ بڑھ گیا پروموشن ہوئی۔ آئیڈیل رشتے کے انتظار میں ترقی کی منازل عبور کرتے کرتے وہ اٹھائیس برس کی ہوگئی۔ تب اس کے کیک پر لگی 28 کے ہندسے والی موم بتی پر جلتا ننھا سا شعلہ نجم صاحب اور آسیہ بیگم کو دل پر بھڑکتے الاؤ جیسا محسوس ہوا اور وہ خواب غفلت سے جاگے۔

دانش 26 اور بریرہ 18 برس کی ہوچکی تھی۔ بریرہ کی دبتی رنگت نوجوانی کے جوبن پہ چمکتے دمکتے نگاہوں کو خیرہ کرتے سونے جیسی ہوچلی تھی۔ اس سے پہلے کہ اساور کی رنگت میں کھلے گلاب مرجھا کر سیاہ پڑجاتے اور لوگ گلابوں کے زیور پر سونے کے زیور کو ترجیح دینے لگ جاتے' انہیں حتمی فیصلہ کرنا تھا اور اب ایسا ہونے بھی لگا تھا۔ اب محفل کی روح رواں بریرہ بنتی جارہی تھی۔ جہاں پہلے اساور کے آگے کسی کو کوئی نظر نہیں آتا تھا وہاں اب بریرہ نظر آنے لگی تھی۔ بیٹوں کی ماؤں کی مرکز نگاہ بھی اب اساور نہیں' بریرہ ہوتی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ اس کے لیے سائبان تھا۔ وہ سائبان جس میں جا بہ جا بڑے بڑے چھید ہوں۔ ایسے چھید جو نہ دھوپ کی تمازت سے بچاسکیں اور نہ ہی طوفان کے تھپیڑوں کے آگے ڈھال بن سکیں۔ وہ ایسا ساتھی تھا' جو ساتھ ہی نہ تھا اور الگ بھی نہ تھا۔ وہ اس کی پوری زندگی تھا' لیکن ایسی زندگی جو تپتی دوپہروں میں لو کے تھپیڑوں کی مانند سلوک کرے۔ سرما کی شدید خنکی سے خشک ہو کر پھٹ جانے والی بدنما ہوتی جلد کے جیسی زندگی تھا وہ شخص۔ جو صرف تکلیف پہنچائے۔ شدید گرمی میں حبس میں تڑپتے جسم کی مانند۔ ایسا تھا اس کا تعلق اس بے مہر شخص سے۔ لق ودق صحرا میں اڑتی دھول کے بگولوں جیسا' جو نہ بیٹھے اور نہ تھمے' بس آنکھوں میں ریت بھر کے اشکبار کیے رکھے۔ ایسا ہی تھا ان دونوں کا ربط۔ خزاں رسیدہ پتے جیسا ایک قدم غلط پڑا اور کڑچ۔ چرم چرا کر ختم۔ پھونک پھونک کر رکھے جانے والے قدموں جیسا تعلق۔ تاریک ہولناک اندھیری رات جیسا۔ وہ اس کا ہم سفر تھا... مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی۔

✡ ✡ ✡

''لوگ دین سے ایسے دور بھاگتے ہیں جیسے کوئی خونخوار جانور دیکھ کر بھاگتا ہے۔ استغفراللہ۔ ہم کون سا بہت زیادہ دین دار ہیں۔ اللہ معاف کرے بس لنگڑے لولے سے قدم اٹھاتے ہیں من مرضی کے چند احکامات پر عمل کرلیتے ہیں ذرا پردہ کرلیتے ہیں اور بس' اس پاک ذات نے اسی پر ایسا رتبہ بنادیا کہ لوگ ہمیں اللہ والے سمجھنے لگے۔ ہمارے ماحول کو گھٹن زدہ اور ہماری اقدار کو انتہا پسندی شمار کرنے لگے۔ ایسے میں بھلا وہ ہمیں بیٹی کیوں دینے لگے ثمو۔ حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے۔'' سعیدہ بیگم اپنی بڑی بیٹی ثمرہ کو سمجھارہی تھیں۔

''لیکن امی... مجھے نہیں لگتا کہ اساور بجو کی سوچ ایسی ہوسکتی ہے۔ وہ بہت مختلف نیچر کی ہیں۔ آسیہ مامی خود ایسی سوچ رکھتی ہیں۔ اگر بجو سے الگ سے پوچھا جائے تو...'' سعیدہ بیگم نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

''نہیں ثمو۔ ایسا کرنے کا سوچنا بھی مت۔ رشتے ناطے کانچ کی مانند ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں شفاف' بے داغ اور خوب صورت' لیکن انہیں برتنے میں احتیاط لازم ہے۔ ورنہ کرچیاں جڑتی نہیں ہیں زخم خوردہ کردیتی ہیں۔ عمر کا جہاں جوڑ اللہ پاک نے بنایا ہے' میری دعا ہے وہی اسے سامنے لانے کا سبب آسانی کے ساتھ پیدا کرے۔'' وہ قطعیت سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں اور وضو کے لیے واش بیسن کی طرف بڑھ گئیں جو لاؤنج کے ایک کونے میں نصب تھا۔ ثمرہ غائب دماغی سے انہیں دیکھتی رہی۔

عمر شہزاد احمد' ان کا پیارا راج دلارا اکلوتا بیٹا تھا جو

ایک مشہور ٹیکسٹائل مل میں انجینئر کے عہدے پر فائز تھا۔ ثمرہ، بریرہ کی ہم عمر تھی اور سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی۔ اس کے بعد نمرہ میٹرک میں اور حمزہ سیونتھ کلاس میں تھی۔ آسیہ ان کی بڑی بھابھی، ان کی سیکنڈ کزن بھی لگتی تھیں۔ سعیدہ کی نندیں نجمہ اور سلمیٰ، آسیہ کی بھابھیاں بھی تھیں۔ نجمہ کے شوہر رؤف اور سلمیٰ کے شوہر منور تھے۔ آسیہ لوگ بس تین بہن بھائی تھے جبکہ شہزاد صاحب تین بھائی اور تین بہنیں تھے۔ سعیدہ بھی گھر کی بڑی بھابھی تھیں۔ شہزاد صاحب کے بعد نجمہ پھر سلمیٰ پھر سمیعہ اور آخر میں بھائی خالد اور شاہد تھے۔ سب کی شادیاں خاندان ہی میں ہوئی تھیں۔ یوں سب کے ددھیال ننھیال ملے جلے تھے۔

نجمہ اور سلمیٰ نے بھی اپنے اپنے بیٹوں کے رشتے اسا اور کے لیے دیے تھے۔ انہیں بھی صاف انکار کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نجم صاحب بیٹی اپنے سے بھی اونچے خاندان میں دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کی خواہش جائز تھی، لیکن بہن بھائیوں کا خلوص انمول ہوتا ہے۔ ان کی نخوت نے سب کا دل دکھایا تھا۔ پھر دونوں بہنوں نے اپنے اپنے بیٹوں کے رشتے ثمرہ کے لیے پیش کردیے۔ بڑے بیٹے ثمرہ کے جوڑ کے نہ تھے سو شہزاد صاحب نے سلمیٰ کے دوسرے نمبر کے بیٹے احمر کے لیے ثمرہ کا رشتہ دے دیا۔ نجمہ سلمیٰ آپس میں دیورانی جٹھانی تھیں اور ان کا ایکا مثالی تھا۔ شہزاد صاحب کی سلمیٰ سے زیادہ بنتی تھی اس لیے انہوں نے اسے ہی رشتہ دیا جس پر نجمہ نے بالکل برا نہیں منایا۔ وہ اپنے بھائی بھابھی کو ماں باپ کا درجہ دیتی تھیں۔ ان کے بچوں کی تربیت کی دل سے معترف تھیں۔

سعیدہ بیگم خاندان میں کسی بھی تقریب میں جاتیں ان کا سر ڈھکا رہتا تھا۔ اسی طرح ان کی بیٹیوں کے سر پر جما اسکارف کبھی ڈھیلا نہیں پڑتا تھا۔ ان کی حتمی المقدور کوشش ہوتی کہ خود کو اور اپنی اولاد کو بڑی برائیوں سے بچائے رکھیں اور ہر ممکن حد تک دین کے احکامات پر عمل کریں۔ جہاں عمل کم ہوتا وہاں بھی وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں، مگر پروقار ڈھکے ہوئے ملبوسات میں سر ڈھکے دھلے دھلائے چہروں پہ معصومیت کو میک اپ کی جگہ اوڑھے سلیقے سے بیٹھی رہتی تھیں۔ ثمرہ اور نمرہ سمجھدار اور سنجیدہ مزاج تھیں البتہ حمزہ سب سے چھوٹی گھر بھر کی لاڈلی تھی اور شوخ مزاج تھی، وہ کبھی کبھی ماں سے الجھ پڑتی تو تب سعیدہ بیگم پیار سے سمجھاتیں اور حجاب میں لپٹے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہتیں۔

''اس حجاب کے ہالے میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہیں میری بیٹیاں۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا حمزہ۔ خوب صورتی کا اثر فوری تو ہوتا ہے، مگر گہرا نہیں۔ حیا کا اثر فوری نہیں، لیکن گہرا اور دیرپا ہوتا ہے اور میری بچیوں میں حیا ہے۔ جو اللہ پاک کا پسندیدہ وصف ہے۔'' تب اس کا قلق دور ہوجاتا تھا ان ہی باتوں کی وجہ سے وہ تینوں مطمئن ہوجاتی تھیں اور حجاب کے ہالے میں خود کو محفوظ محسوس کرنے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

مجھ میں بے لوث محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
تم جو چاہو میری سوچوں کی تلاشی لے لو

رات کا دوسرا پہر تھا، رات چاندنی بھی نہ تھی۔ اسے چاندنی رات پسند بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ اپنے محبتوں اور شدتوں میں چاند کو بھی ہمراز بنانا گوارا نہ کرتا تھا۔ وہ چاند جو جوبن کی راتوں میں عین اس کی کھڑکی کے سامنے اونچائی پہ کھڑا مسکراتا ہوا اس کے کمرے میں تانکا جھانکی کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ایسے میں وہ کمرے کی کھڑکی بند کرکے پردے بھی برابر کردیتا تھا۔ اس کا محبوب ستاروں جیسا تھا، سو اسے ستارے ہی پسند تھے۔ نور کا منبع۔

لازم تو نہیں کہ زباں اظہار کرے
کچھ جذبوں کو احساس ہوا دیتے ہیں
خاموش محبت بھی عبادت ہے فراز
ایسی محبت کو فرشتے بھی دعا دیتے ہیں

اب پتا نہیں اس کی محبت کو فرشتے دعا دیتے تھے یا نہیں۔ اس کی بس اتنی ہی خواہش تھی کہ اس کی خوشیاں بھی اسے مل جائیں اس پری وش کو' جو اس کی روح پہ قابض تھی' دل و جان میں جزو لازم کی طرح بسی تھی۔ جس کے خیال سے وہ لمحہ بھر بھی جدا نہیں ہو پاتا تھا۔ یہ اس کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ بے خبر تھی اور یہ باخبری کے امتحان میں گھرا نالائق طالب علم۔ اگر وہ چاہتا تو اس سے اظہار محبت کر کے اسے پا سکتا تھا' لیکن یہ اس کی اقدار کے منافی تھا۔ وہ ایسی کسی بھی حرکت کو چھچھورپن گردانتا تھا۔ خواہ اسے نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑتا اور وہ اسے کھو دینے کو نقصان سمجھتا بھی کب تھا۔

''محبت ملن سے مشروط نہیں۔''

یہ اس کا فلسفہ تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کے لیے یہی احساس خزینہ زیست کی مانند تھا۔

☼ ☼ ☼

نجمہ اور سلمیٰ ابھی ابھی رخصت ہوئی تھیں۔ بریرہ اور اساور گیٹ تک ان کے ساتھ گئی تھیں۔ آسیہ بیگم میں ہمت ہی نہ تھی۔ لاؤنج کی سینٹر ٹیبل پر چمکیلے خوب صورت نیلے ریپر میں لپٹا وہ ایک کلو مٹھائی کا ڈبا انہیں کیکٹس کے پودے کی مانند لگ رہا تھا۔ آسیہ بیگم اور نجم صاحب ساکت بیٹھے تھے۔

انہیں خلوص سے لایا گیا وہ ڈبا اپنے چہروں پر طمانچوں کی صورت محسوس ہو رہا تھا گو کہ سلمیٰ اور نجمہ نے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا تھا کوئی طنز طعنہ نہیں دیا تھا۔ ان کے انداز نارمل ہی تھے۔ انہیں بھی تعلقات کی خرابی کا ڈر تھا نہ ہی وہ سلمیٰ اور نجمہ کے بیٹوں میں سے کسی کے لیے راضی تھے۔ غرور ٹوٹا تو اب بھی نہیں تھا۔ انہیں جو چیز کند چھری سے زخم دے رہی تھی وہ تھی ثمرہ کی عمر۔ یعنی اس کی کم عمری۔ وہ ان کی بریرہ کی ہم عمر تھی اور منگنی شدہ ہو گئی تھی یہاں بھی اب اساور کو چھوڑ کر بریرہ کے لیے رشتوں کی لائن لگنی شروع ہو گئی تھی۔ ان کی تشویش بجا تھی۔ اب بھی نہ ہوتی تو سراسر بے وقوفی ہوتی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فی الوقت موجود چند رشتوں پہ نظر ثانی کی اور کالز کر کے ملاقات کے اوقات طے کیے اس پورے ہفتے وہ ان فیملیز سے ملاقاتیں کرتے رہے فون پر معاملات ڈسکس کرتے رہے ادھر ادھر انویسٹی گیشن کرواتے رہے۔ بالاخر دو ہفتے بعد وہ حتمی نتیجے پر پہنچ ہی گئے۔ تین میں سے ایک رشتہ فائنل ہو گیا۔

سلمان علی... ایک نامور کنسٹرکشن کمپنی میں پراجیکٹ انجینئر کے عہدے پر فائز' اعلا سرکاری عہدے سے ریٹائرڈ جاگیردار باپ کا چھوٹا بیٹا تھا۔ ماں معروف این جی او کی ڈائریکٹر تھی۔ بڑا بھائی معروف چائلڈ اسپیشلسٹ' بھابھی گائنا کالوجسٹ اور بہن اسکن اسپیشلسٹ' بہنوئی ہارٹ سرجن۔ گھر کا ماحول آزادانہ' اسلام آباد کے پوش ایریا میں بنگلہ تھا۔ بس اور کیا چاہیے۔ بس ایک ڈیمانڈ تھی لڑکے کی طرف سے کہ اساور جاب چھوڑ دے۔ جہاں خاندان کا ہر فرد جاب کر رہا تھا وہاں ایسی ڈیمانڈ عجیب تو لگی' لیکن یہ سوچ کر پروا نہ کی کہ گھر کی عورتوں کو جاب کرتا دیکھ کر مرد ''عموماً'' بے زار آجاتے ہیں۔ سلمان بھی ایسا ہی ہو گا۔ منگنی کا ان کے ہاں رواج نہ تھا۔ نکاح پر اصرار کیا گیا۔ نجم صاحب نے ہامی بھرلی اور ساتھ ہی اساور کو جاب سے ریزائن کرنے کا کہہ دیا گیا۔ سال بھر بعد رخصتی ہونی تھی۔ یوں نکاح کا فنکشن ارینج کر لیا گیا۔ میرٹ اسلام آباد کے کرسٹل بال روم ہال میں بکنگ کروائی گئی۔ نجم صاحب نے گویا تجوری کا منہ کھول دیا۔

''سب کچھ اتنا عالیشان اور شاندار ہونا چاہیے کہ یہ فنکشن مدتوں یاد رہے۔'' نجم صاحب تکبر سے بولے۔ یہ فنکشن مدتوں ہی یاد رکھا جانے والا تھا۔ ان کی بات حرف بہ حرف پوری ہونی تھی۔ اسٹیج' سجاوٹ' کیٹرنگ' مینو' استقبال ہر چیز بے مثال تھی۔ لازوال تھی۔ ٹی پنک پھولوں سے سجے اسٹیج پہ ایک شان اور تمکنت سے بیٹھی اساور مجسم مکمل سفید لباس میں شہزادی ہی تو لگ رہی تھی۔ سلمان کی چوائس پر اس کا

اور اساور دونوں کا لباس مکمل سفید تھا۔ چاند سورج کی جوڑی سجی تھی۔

پھر نکاح کی رسم کا وقت آیا اور اساور نجم لمحوں میں اساور سلمان علی بن گئی۔ آنسو ٹوٹ کر گال پر سے پھسلتے ہوئے نکاح نامے پہ گرے تو آسیہ بیگم ضبط بھلا کر اساور سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ بریرہ کے بھی آنسو بہہ نکلے۔ وہ دانش کے کاندھے سے لگ کر سسکنے لگی۔ مہمانوں کے ڈنر کے دوران اساور دوستوں کے ہمراہ رہی تو ان کی خوش گپیوں اور چھیڑ چھاڑ سے وہ بہتر محسوس کرنے لگی۔ آسیہ بیگم اور بریرہ بھی نارمل ہو چکی تھیں۔ محفل میں پھر سے رنگ بکھر گئے تھے۔ خاندان کی کچھ چلبلی لڑکیاں ڈانس پیش کرنے کے لیے ڈیک پر گانا سیٹ کروا رہی تھیں۔ سعیدہ بیگم حسب طریق اپنی بیٹیوں کے ساتھ ایک کونے میں قدرے الگ تھلگ سی ٹیبل پر پورے وقار کے ساتھ براجمان تھیں۔ نجم صاحب اب پرسکون بیٹھے شہزاد صاحب سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ اسٹیج پر سلمان علی کے پہلو میں طمانیت سے بیٹھی اساور کسی بات پہ مسکرا رہی تھی۔ آسیہ بیگم اسے دیکھ کر کھل کر مسکرائیں۔ اسٹیج سے کافی دور انٹرنس کے پاس کھڑے عشق کے پیکر کی دو محبت بھری آنکھوں نے اپنی اولین محبت کو مسکراتے دیکھا اور خود بھی مسکرا دیا۔ اس کی زندگی خوش تھی اس کے چار سو خوشیوں کی کلیاں چٹکنے لگیں۔ وہ کلیوں کو پھول بنتا دیکھتا رہا۔ ہر شخص کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ کا محرک جدا تھا، ہر شخص دوسرے کے محرک سے انجان تھا۔ صد شکر کہ انسان غیب کا علم نہیں جانتا۔

☼ ☼ ☼

نجم صاحب سکون سے آنکھیں موند لیتے، آسیہ بیگم شکر کے سجدے میں گر جاتیں، بریرہ کی آنکھوں میں شرارت مچلنے لگتی اور دانش مبہم سا مسکرا کر ادھر ادھر ہو جاتا جب اساور کے قہقہے سنائی دیتے، جب اس کے چہرے پہ شفق، دھنک جیسے رنگ بکھراتی اور وہ ست رنگ اس کے چہرے کو کھلتا پھول بنا دیتے۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے اپنے دل میں مقام دے دیا ہے۔ سلمان تقریباً "روز ہی اسے کال کرتا لمبی لمبی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی خوش مزاج سا بندہ تھا اور اس کا سینس آف ہیومر بھی غضب کا تھا۔ بس ایک بات تھی کہ وہ گھر اور گھر والوں کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی اساور بات کرتی تو وہ خوب صورتی سے ٹال جاتا تھا۔ اس کی باتوں سے ہمیشہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یورپ سیٹل ہونا چاہتا ہے۔ اس کی فیملی ویل آف تھی، لیکن ملک سے باہر جانے کا شاید کسی نے نہیں سوچا تھا۔ اس کے بہن بھائی نے اسپیشلائزیشن بھی پاکستان سے ہی کیے تھے۔ البتہ اس نے اپنے جیٹھ احسان علی کی بیوی مریم کے بارے میں سنا تھا کہ اس نے اسپیشلائزیشن امریکا سے کیا تھا اور وہ شادی کے بعد امریکا ہی سیٹل ہونا چاہتی تھی، لیکن احسان نہیں مانتے تھے سو وہ بھی یہیں جاب کر رہی تھی۔ یہ سب باتیں ابتدائی ملاقاتوں میں معلوم ہوئی تھیں اور بس۔ اس کے بعد ان کی جانب سے خاص آمد و رفت بھی نہ ہوتی تھی اور نہ ہی سلمان کوئی گھریلو بات کرتا تھا۔

اساور کی جاب سے متعلق بھی اس نے یہی کہا تھا کہ اسے جاب کرنے والی لڑکیاں پسند نہیں، خاص طور سے وہ شادی کے بعد خواتین کی جاب کے حق میں بالکل نہ تھا۔ یہ ایک بالکل نارمل سی بات تھی جس گھر کی تمام خواتین جاب کرتی ہوں وہاں عموماً" کوئی نہ کوئی اولاد اس سیٹ اپ کے خلاف ضرور ہوتی ہے۔ بس یہی سوچ کر اساور نے اپنی اتنی بہترین جاب سے ریزائن کرتے ہوئے ذرا بھی قلق محسوس نہ کیا۔ آسیہ بیگم نے بھی اسے یہی کہہ کر سمجھایا تھا کہ

"بیٹا شادی کے بعد عورت کی جاب صرف اس کا گھر ہونی چاہیے۔ شوہر کی کیئر، بچوں کی بہترین تربیت اور نوکروں کی بجائے اپنے ہاتھ سے کام کرنا، نوکروں پر کم سے کم انحصار کرنا ہی عورت کی جاب کے جزو ہیں۔" اساور دل سے قائل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اساور اور سلمان کی اچھی انڈراسٹینڈنگ ہوگئی تھی۔ اب وہ اکثر دن میں کئی بار کال کرلیتا تھا۔ البتہ نکاح کے بعد سے نہ تو ان کے گھر سے کوئی اساور کے گھر آیا تھا نہ ہی سلمان نے کبھی ساس سسر یا سالے' سالی سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دونوں بس ایک دوسرے میں ہی خوش اور مگن تھے۔ نکاح بلاشبہ ایک مضبوط بندھن ہے۔ منگنی کا رشتہ ہوتا تو آسیہ بیگم تشویش کا شکار ہوتیں' لیکن اب وہ بھی مطمئن تھیں۔ ان ہی سکون بھرے روز و شب میں بریرہ کے لیے ایک انتہائی بہترین پرپوزل آیا۔ مسعود لغاری' مشہور انڈسٹریلسٹ تھے اور ان کی وائف مسز شاہانہ مسعود کا اسلام آباد میں ذاتی پارلر تھا جس کا بڑا نام اور رتبہ تھا۔ شاہانہ بھی عام پارلر اونرز کی طرح پرسنالٹی کے برعکس انتہائی ڈیسنٹ' ویل ڈریسڈ اور سوبر خاتون تھیں اور ان کے چہرے پر انتہائی نیچرل میک اپ ہمہ وقت رہتا تھا ان کے دو ہی بچے تھے۔ بڑی بیٹی رامین ایم فل سائیکالوجی تھی اور شادی کے بعد شوہر کے ہمراہ کینیڈا اسیٹل تھی۔ اکلوتا بیٹا اسفندیار لغاری سوفٹ ویئر انجینئر تھا۔ یہ پوری فیملی کینیڈین نیشنل تھی اس لیے اسفندیار اور رامین کی تعلیم بیرون ملک ہی ہوئی تھی۔ اسفندیار کا اپنا سافٹ ویئر ہاؤس تھا۔ بریرہ سے اسفندیار کی عمر کا فرق واضح تھا' لیکن سوچ بچار اور تحقیقات کے بعد نجم صاحب اتنے مطمئن ہوئے کہ یہ فرق نظر انداز کردیا گیا۔ بریرہ محض انٹر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اسفندیار کی فیملی میں سب ہی اعلا تعلیم یافتہ تھے۔ اس عذر پر شاہانہ بیگم نے وعدہ کیا کہ وہ لوگ خود بریرہ کو اعلا تعلیم دلوانے میں بھرپور تعاون کریں گے۔ اس معاملے میں اسفندیار بھی ہم خیال تھا۔ انہیں بریرہ اس قدر پسند آگئی تھی کہ وہ ہر عذر کو چٹکیوں میں اڑا رہی تھیں۔ یوں اساور کے نکاح کے ٹھیک چھ ماہ بعد بریرہ کے بھی نکاح کی تاریخ رکھ دی گئی۔ رخصتی دونوں بہنوں کی ایک ساتھ ہونا طے پائی۔ ان تمام

فیصلوں میں اساور کے سسرالیوں کو بھی بھرپور طریقے سے شامل رکھا گیا۔

یوں ایک سہانی سی شام اسی سی بی آر ہال میں بریرہ بھی دلہن کا روپ دھارے بجلیاں گراتی اسٹیج پر براجمان تھی۔ بوٹل گرین اور انک بلیو کامدار لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس میچنگ زیورات اور لائٹ، مگر خوب صورت میک اپ میں پریوں کا سا معصوم روپ لیے بریرہ اپنے شہزادوں سی آن بان والے شریک حیات کے ہمراہ بیٹھی خوب جچ رہی تھی۔ اسے یہ اعزاز حاصل تھا کہ اسے اس کی ساس نے خود تیار کیا تھا جو کہ اپنے پارلر میں صرف چنیدہ برائڈز کو ہی تیار کرتی تھیں ایک عالم بریرہ کی قسمت پر رشک کر رہا تھا، مسٹر اینڈ مسز لغاری کی شہرت ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ شہر کی کریم کی حیثیت سے سب ہی انہیں پہچانتے تھے۔ فنکشن میں سلمان تمام وقت اساور کے ہمراہ رہا۔ اس نے فخر سے اسے سب سے ملوایا تھا۔ اس کی چھوٹی لاڈلی بہن کا نکاح تھا۔ اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے برعکس سلمان چپ چپ سا رہا۔ بڑا داماد ہونے کے ناطے اسے بیٹوں کی طرح نجم صاحب کے ساتھ انتظامات میں پیش پیش رہنا چاہیے تھا، لیکن وہ وی آئی پی گیسٹ بنا رہا۔

بیٹی خوش ہو تو ماں باپ داماد کی ہزاروں خامیوں کو اگنور کر دیتے ہیں اور کسی بھی شکوے کو زبان پہ لانے سے پہلے ہی دفن کر دیتے ہیں۔ ماں باپ کے لیے ہر لحظہ اپنی اولاد کی خوشی مقدم ہوتی ہے۔ ایک بار والدین کے عہدے پہ فائز ہو جانے کے بعد وہ اپنی خوشی اپنی چاہت حرف غلط کی طرح فراموش کر دیتے ہیں بس نجم صاحب اور آسیہ بھی اسی کیفیت میں تھے۔ ان کی پلاننگ اس بار بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی، وہ اسی سرخوشی میں اپنی بروقت عقل مندانہ حکمت عملی پر لوگوں سے داد و تحسین وصولتے پھر رہے تھے۔ جب انسان عروج پر بیٹھا ہو تو اس کی گردن پر سجا خوش نما چہرہ اونچا ہی رہتا ہے وہ جہاں سے گزرتا ہے اٹھے سر کے ساتھ گزرتا ہے اور اٹھے سر کے ساتھ چلتے ہوئے وہ زمین پہ گرا کیلے کا چھلکا نہیں دیکھ پاتا۔ کیلے کا چھلکا، جو الٹا گرا ہو تب چھلکا پھسلتا ہے اور اگر سیدھا گرا ہو تب اس پر آنے والا پاؤں پھسلتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان گرتا ہے اور بری طرح گرتا ہے۔ کمر کے بل گرتا ہے اور منہ کے بل گرنے والے نہیں جانتے کہ کمر کے بل گرنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ وجود کا سارا بوجھ اس کمر پر ہی تو ہوتا ہے۔ نجم صاحب اور آسیہ بیگم کی کمر توڑنے کے لیے سلمان علی بھی کیلے کا چھلکا ثابت ہونے والا تھا۔ الٹا ہو تا یا سیدھا گرنا لازم ہے۔

✡ ✡ ✡

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے
کسی چراغ میں ہم ہیں کسی کنول میں تم
کہیں جمال ہمارا کہیں تمہارا ہے
وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشے میں
تمام عمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے
ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارہ کہ یہ دوبارہ ہے
وہ منکشف مری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حسن کسی حسن کا اشارہ ہے
عجب اصول ہیں اس کاروبار دنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اتارا ہے
کہیں یہ ہے کوئی خوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالم موجود استعارا ہے
نجانے کب تھا! کہاں تھا مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے
یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے ہم تم
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے

وہ اپنے روز مرہ کے جنون میں مگن تھا۔ روز ڈائری لکھنا، روز اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے اشعار ڈھونڈنا انہیں ڈائری میں رقم کرنا اس کا نام لکھنا اور لکھتے ہی

جانا۔ شاید کبھی اس ماہ رو ماہ جبیں کو یہ سب شدتیں دکھانے کا موقع مل ہی جائے۔ شاید کبھی وہ اس کے دل کے ساتھ ساتھ اس کی دنیا میں بھی رنگینی بکھرانے آہی جائے۔ بس وہ ایسا ہی تھا۔ اپنے ہی جذبوں میں قناعت پسند۔ بے لوث۔

☼ ☼ ☼

بریرہ کے نکاح کے بعد سے اساور کو سلمان کے بدلے بدلے انداز کھٹک رہے تھے۔ اس کے رویے میں عجیب سی رکھائی اور سرد مہری ہوتی تھی۔ اساور مزاجاً" صلح جو اور نرم خو لڑکی تھی اور لڑائی جھگڑوں اور اختلافات سے دور بھاگتی تھی۔ سو سلمان کی رکھائی محسوس کرنے کے باوجود اس نے سوال کرنے سے پرہیز کیا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ اپنا رویہ نارمل رکھے تاکہ وہ بھی دھیرے دھیرے نارمل ہو جائے، لیکن اب ایسا ہونا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بلی تھیلے سے باہر آہی گئی۔ اس روز بھی دوپہر کو وہ لنچ کے بعد آرام کی غرض سے کمرے میں آئی تھی جب سلمان کی کال آئی۔ بیڈ پر نیم دراز وہ اس سے گپ شپ میں مگن ہو گئی۔ باتوں باتوں میں بریرہ کی سسرال کا تذکرہ آیا تو سلمان بھڑک اٹھا۔

"بڑی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے تم لوگوں نے۔ مانتا ہوں بڑے لوگ ملے ہیں تمہاری بہن کو، لیکن اب تم لوگ ہر وقت اسی کا راگ الاپتے رہو گے کیا؟" اس کے تذلیل بھرے انداز پر اساور دنگ ہی تو رہ گئی۔ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ پھر بدقت خود کو نارمل کیا اور قصداً" ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

"تو آپ کوئی کسی سے کم ہیں کیا؟" اس نے جان بوجھ کر دلبرانہ انداز اپنایا اور مزید بولی۔

"اچھا ہے نا بریرہ کو ایسا بندہ ملا ورنہ ہمارا کپل دیکھ دیکھ کر بریرہ خوامخواہ جیلس فیل کرتی رہتی۔" محض سلمان کو نارمل کرنے کی خاطر وہ ایسی اوچھی بات کہہ گئی ورنہ سب جانتے تھے کہ بریرہ بہن پر جان دیتی ہے۔

"تو کیا اب تم حسد محسوس نہیں کرتی بریرہ سے؟" کچھ بری طرح سے چبھا تھا اساور کو۔ وہ پھر ضبط سے پی گئی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو سلمان۔ آپ اپنا موازنہ اسفندیار سے کیوں کر رہے ہیں۔ میرے لیے آپ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شخص نہیں۔" اس کی بات کی صداقت میں ایک فیصد بھی شک کی گنجائش نہ تھی، لیکن وہ جانتی نہیں تھی کہ ابھی مزید اسے کیا کیا بھگتنا ہے۔

"نکاح والے روز جیسے تم کھلی پڑ رہیں تھی، اس کا تعارف کرواتے وقت تمہارے انداز میں جو فخر و غرور تھا، اساور صاحبہ میں اندھا نہیں ہوں۔ اتنی خوش تو تم میرے ساتھ کبھی نہیں ہوئی۔" وہ منجمد ہو گئی۔ یہ سب کچھ ٹھیک سے چلتے چلتے اچانک غلط کیوں ہونے لگا تھا، اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ بہت مشکل سے ہمت مجتمع کر کے جب وہ بولی تو اس کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں سلمان، وہ میری چھوٹی لاڈلی بہن ہے۔ اس کے حوالے سے اسفندیار بھی میرے لیے دانش جیسا۔۔۔" سلمان تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"اسفندیار نہ تو دانش جیسا ہے نہ وہ دانش ہے۔ وہ تمہارا بہنوئی ہے اور نامحرم ہے تمہارے لیے۔"

"نامحرم۔" اساور نے تعجب سے موبائل کان سے ہٹا کر اسے گھورا۔ یہ لفظ اس مخص کے منہ سے کچھ اجنبی سا لگ رہا تھا جس کا خاندان پاکستان میں ہی لندن، امریکا کا کلچر لے کر چلتا تھا اسے یہ لفظ عجیب لگنے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ دین ان کے خاندان کے لیے بھی نماز، روزہ، زکوۃ سے آگے کچھ بھی نہ تھا، لیکن ناجائز وکالت کے وقت دین وہ آخری کیل جیسا حربہ ہوتا ہے۔ جو دنیادار لوگ آزماتے ہیں اور بڑی ڈھیٹ قسم کی بے شرمی سے آزماتے ہیں۔ اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے۔

"اس قدر تو تم اب تک مجھ سے بھی فرینک نہیں

ہوئی جتنا تم اسفندیار سے فری ہو رہی تھی۔ میں جو تمہارا شوہر ہوں۔ تمہاری وفاؤں کا اصل حق دار۔"

"سلمان..." اساور چیخی۔

"میری وفاؤں پہ شک کر کے مجھے میری ہی نظروں میں مت گرائیں۔ میرے لیے آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔" بے بسی سے وہ رو پڑی۔ دانش ور کہتے ہیں کہ جو آپ کا دوست ہے اسے آپ کی وضاحتوں کی ضرورت نہیں اور جو دشمن ہے وہ کبھی آپ کی وضاحتوں کا اعتبار نہیں کرے گا۔ وہ سلمان کو کس کیٹگری میں ڈالتی؟ یہ ہمارا المیہ ہے کہ آج کل سب سے زیادہ وضاحتیں ہمیں اپنوں کو ہی دینی پڑتی ہیں۔ وہ رو رہی تھی اور سلمان اعتبار نہیں کر رہا تھا۔ ابھی اسے ایک لمبا عرصہ وضاحتیں دینی تھیں۔

"اب یہ رونا دھونا بند کرو اور یہ بات یاد رکھنا کہ مجھے تمہارا یوں ہر کسی سے فری ہونا قطعی پسند نہیں۔" سلمان کا انداز بے لچک اور دو ٹوک تھا۔ اساور کے آنسو یک لخت تھم گئے۔ وہ ہاتھوں سے چہرہ رگڑ کر بے تاثر لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" چند ایک باتوں کے بعد سلمان نے فون بند کر دیا۔ اساور کتنی ہی دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی۔ اس نے خود کو بہلانے کے لیے تاویلیں گھڑلیں۔

"کوئی بات نہیں کچھ مرد ایسے ہوتے ہیں، اپنے قریبی رشتوں کے حوالے سے ازحد پوزیسو۔ میں آئندہ احتیاط سے چلوں تو ان کی شکایات دور ہو سکتی ہیں۔" وہ اساور تھی۔ بہل سکتی تھی، لیکن مدمقابل سلمان علی تھا۔ اسے بہلانا ممکن ہی نہ تھا۔ نجم صاحب جگہ جگہ کہتے پھرتے تھے۔

"ہم نے داماد ایسا چنا ہے جو لاکھوں میں ایک ہے۔" وہ بالکل صحیح دعوا کرتے تھے۔ سلمان علی واقعی لاکھوں میں ایک تھا۔ عقل کل بننے والے کو حقیقی عقل کل خواب غفلت سے جگانے والا تھا۔ بہت جلد......

☆ ☆ ☆

تلخ حقیقتوں کے بے نقاب ہونے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ انسان فطرتاً "خوش گمان ہے شاید اسی لیے لمبی عمر جیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب اساور کی خوش گمانیوں کے گھروندے کو پہلی شدید ترین ضرب لگی۔ وہ آسیہ بیگم کے ساتھ کچن میں ڈنر کی تیاری کے دوران مدد کروا رہی تھی۔ نجم صاحب کسی کلائنٹ کے ساتھ کال پہ بات کرتے کرتے روم میں چلے گئے تھے۔ اوپن کچن سے وہ سامنے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے دانش اور بریرہ پر گاہے بگاہے نظریں ڈال لیتی تھی۔ وہ چمکتے دمکتے کاؤنٹر پر سبزیاں پھیلائے کھٹا کھٹ سلاد کے لیے سبزیاں کاٹ رہی تھی جب ذرا فاصلے پر پڑا اس کا موبائل روشن ہوا۔ رنگ ٹون کی آواز پر آسیہ بیگم نے ہنڈیا بھونتے بھونتے مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جس کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی تھی۔

"امی جسٹ ویٹ سمیعہ کی کال ہے۔ میں آتی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی کچن ٹاول سے ہاتھ پونچھتی موبائل اٹھا کر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ آسیہ بیگم نے سلاد کے لیے بریرہ کو بلا لیا۔ وہ جانتی تھیں سمیعہ اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اور دو سال قبل ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ سخت گیر سسرال میں پریشان رہا کرتی تھی تو کبھی کبھی اساور سے بات کر کے دل ہلکا کر لیا کرتی تھی۔ آسیہ بیگم کو وہ ذاتی طور پر بے حد پسند تھی۔ بے حد سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اگر دانش سے بڑی نہ ہوتی تو وہ ضرور اسے بہو بنا لیتیں۔ اس وقت بھی وہ پریشان ہی تھی اس لیے اساور کو کال کی تھی۔ اس سے بات کرتے کرتے اساور اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ قریباً" دس منٹ گزرے ہوں گے جب کال ویٹنگ بیپ بجنے لگی۔ اساور نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا "سلمان کالنگ" وہ متذبذب ہو گئی، لیکن سمیعہ کو بیچ میں ٹوکنا اسے بالکل مناسب نہیں لگا تو اس نے سوچا کہ سلمان کال کو ویٹنگ پہ دیکھ کر خود ہی انتظار کر لے گا، مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ سلمان نے کال کرنا ترک نہیں کیا۔ اس نے سمیعہ سے معذرت کر کے سلمان کی کال لی۔ اور....

"کس سے بات ہو رہی تھی جو میری کالز اگنور کرتی رہی تم۔۔۔" اس کے انداز میں رچے بسے شک نے اساور کو سانپ کی طرح ڈسا وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ اس نہج پر آجائے گا۔ اس نے لاکھ وضاحتیں دیں، مگر وہ قائل نہیں ہوا۔ چھ ماہ جان چھڑکنے والے محبت بھرے شوہر کا رول پلے کرتے کرتے یکایک وہ پینترا بدل کر روایتی شوہرانہ حاکمیت دکھانے لگا تھا' یہ کایا پلٹ اساور کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اپنی یہ درجن بھر دوستیاں ختم کرو مجھے یہ فضولیات بالکل پسند نہیں۔ شادی کے بعد تمہارے تمام روابط ختم۔ خواہ وہ دوست ہوں یا رشتہ دار۔ میں کل ہی تمہیں نئی سم بھجوا دوں گا۔ اس میں صرف اور صرف میرا نمبر ہونا چاہیے۔ سمجھی تم۔ صرف میرا نمبر۔"

"سمجھ گئی۔"

"گڈ۔" مردانہ انا کو تسکین ملی تھی۔ نسوانی پندار کو ٹھیس لگی تھی۔ اگلے دن نئی سم پہنچ گئی۔ اس نے اس میں سلمان اور اپنے گھر والوں کے نمبرز سیو کرکے پرانی سم توڑ کر پھینک دی۔ اگر وہ اس چیز سے خوش ہوتا تھا تو اساور کے نزدیک یہ برا سودا نہ تھا' لیکن اگر وہ خوش ہو بھی جاتا تو۔۔۔

اس کے اعتراضات کی فہرست طویل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جواب دیتی تو بھی پھنستی' چپ رہتی تب بھی وہ بھڑکتا۔ بس وہ مہر بہ لب سہتی جا رہی تھی' اس نے کسی کو اس معاملے کی بھنک نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ خود کو اپنی طفل تسلیوں سے بہلا رہی تھی کہ رخصتی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا' لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ حالات بگڑتے ہی جا رہے تھے۔ ان ہی دنوں دانش کو (اے سی سی اے) ACCA مکمل کرتے ہی لاہور میں جاب آفر ہوئی۔ آفرز اسلام آباد کی بھی تھیں' لیکن لاہور والی آفر بے حد پرکشش تھی۔ گھر والوں سے بے حد منت کے باوجود اسے یہ آفر قبول کرنا تھی' کیریئر کا معاملہ تھا۔ سب نے دل پر پتھر رکھ کر

اسے دعاؤں کے سنگ رخصت کیا تھا' لیکن اسے جذباتی طور پر ایڈجسٹ کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ جاب کے بعد جونہی وہ فارغ ہوتا گھر فون کرتا ایک ایک فرد سے بات کرتا کبھی اسکائپ پر بلا لیتا۔ وہ اساور سے بہت اٹیچڈ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی کمی بری طرح محسوس کرتے تھے۔

اس روز بھی معمول کے مطابق سب سے بات کرنے کے بعد اس نے اساور کو دوبارہ اس کے موبائل پر کال کی۔ انہیں بات کرتے بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ بیچ میں سلمان کی کال آنے لگی۔ اس نے بے پناہ کوفت محسوس کرتے ہوئے دانش کو کال بیک کرنے کا کہا اور سلمان کی کال وصول کی۔ دوسری طرف وہ بھرا بیٹھا تھا۔

"تمہیں عزت کی زبان راس نہیں آتی جب میں نے بکواس کی تھی کہ یہ نمبر کسی کو نہیں دینا تو۔۔۔"

"کسی کو نہیں دیا۔ یہ دانش کی کال تھی' وہ لاہور چلا گیا ہے تو ہمیں۔۔۔" ایک بار پھر اس کی بات پوری نہیں ہوئی۔

"تو ہیل ود۔۔۔ جب میں نے کہہ دیا کہ کوئی نہیں تو کوئی نہیں۔ کیا مجھے ہر روز نئے سرے سے قواعد و قوانین دہرانے پڑیں گے؟"

"آپ ایک ہی بار تفصیل سے تمام قواعد و قوانین کلیئر کردیں۔ بہتر ہوگا۔" پہلی بار اس کے لہجے میں تلخی جھلکی۔

"تو ٹھیک ہے پھر سنو۔ نہ کوئی دوستیاں نہ کوئی تعلق داریاں۔ تمہارا تعلق صرف مجھ سے ہے اور رخصتی کے بعد تمہارا موبائل بھی ختم۔ گھر والوں سے جب مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو خود بات کروا دیا کروں گا۔ ملنے کے لیے بھی تم نہیں جاؤ گی وہ لوگ آیا کریں چند گھنٹے گزار کے واپس اور میکے میں رات رہنے کا تو بھول ہی جانا۔ مجھے عورت گھر میں اچھی لگتی ہے۔ نو آؤٹنگ' نو ہوٹلنگ' نو شاپنگ۔ تمہاری ضرورت کی ہر چیز تمہیں گھر پر مل جایا کرے گی۔ مجھے تمہارا آوارہ عورتوں کی طرح باہر پھرنا بالکل پسند

نہیں۔" اساور کا دل کٹ کٹ کر خون ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے فریز ہو گئی تھی۔ شدید خواہش کے باوجود وہ یہ جملہ لبوں پہ لانے سے قاصر تھی کہ

"تمہاری ماں، بہن، بھابھی کیا سب آوارہ عورتیں ہیں؟" اس وقت اس کا صرف دماغ کام کر رہا تھا، جسم جیسے مفلوج ہو چکا تھا۔

"ابھی سوچ لو۔ اختلاف ہے تو ابھی فیصلہ کر دیتا ہوں۔" اس جملے میں پنہاں دھمکی نے اساور کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی بھر دی۔

"نہیں۔ ٹھیک ہے۔ آپ کو آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔"

"گڈ۔"

"کیا میری ساری عمر اسی ڈکٹیشن میں گزرے گی؟"

"کیا یہ سب اب تک کی پر تعیش سہل زندگی گزارنے کی سزا ہے؟۔"

"کیا یہ میرے ماں باپ کے تکبر کی سزا ہے؟۔"

سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں سے پانی کا ایک قطرہ ٹپکا اور پھر وہ پتلی سی لکیر کی صورت اس کے گال پہ تیرتا ہوا ٹھوڑی پہ جا رکا۔ اگلی لکیر کے اس قطرے تک پہنچنے پہ وہ لڑھک کر اس کی گود میں جا گرا۔ اور بھی قطاریں بندھ گئیں۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ زندگی اسے ایسے بھیانک موڑ پر لا کھڑا کرے گی جہاں آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ ہوگا۔ جب نہ زخموں پر لگانے کو مرہم ملے گا اور نہ ہی پیاس بجھانے کو پانی۔

☼ ☼ ☼

محبت اس طرح جیسے گلابی تتلیوں کے پر
محبت زندگانی کی جبین ناز کا جھومر
محبت آرزو کی سیپ کا انمول سا گوہر
محبت حسرتوں کی دھوپ میں امید کی چادر
محبت ہے تیرے گیسو
تیری پلکیں
تیری آنکھیں
محبت ہے تیری باتیں
محبت ہے تمہارے ہجر کی اور وصل کی راتیں
محبت ہے تیری دھڑکن
محبت ہے تیری سانسیں
محبت تیری خاموشی
تمہاری بات جیسی ہے
محبت کو اگر سمجھو تمہاری ذات جیسی ہے۔

ڈائری لکھتے لکھتے اس نے آخر میں یہ نظم لکھی اور پین ڈائری کے بیچ میں رکھ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ہر رات کا پہلا پہر وہ اپنی خاموش محبت کے نام کرتا تھا جو بھی اس کے دل میں ہوتا اسے حوالہ قرطاس کر کے پر سکون ہو جاتا تھا۔ کئی سال گزر گئے تھے اور ڈائریاں بھر پڑی تھیں اس کے دل کی حکایتوں سے۔ کئی سالوں سے وہ صرف ڈائری کو ہمراز بنائے بیٹھا تھا۔ اگر وہ سارا مواد جمع کرتا تو اس کی خاموش محبت پر ایک بے حد دل فریب ناول تخلیق ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس سوچ پر ہنس دیتا تھا۔ اگر وہ ادیب ہوتا تو ناول تیار کر بھی چکا ہوتا، لیکن وہ صرف محب تھا۔ وہ صرف اپنے جذبے کاغذوں کے حوالے کرتا تھا۔ اگر وہ کوشش کرتا تو شاعر بھی بن سکتا تھا، لیکن وہ دوسروں کی شاعری میں اپنے دل کی کیفیات ڈھونڈ کر رقم کرنے پر ہی اکتفا کرتا تھا۔ شاید اسے اعتماد نہ تھا اپنی تحریری اور فنی صلاحیتوں پر۔ اعتماد اگر تھا تو بس ایک چیز پر۔

اپنی محبت پر، اپنے جذبوں پر، اپنی سچائی پر، اپنی محبت کے لیے اپنے جذبوں کی سچائی پر۔ سچا شخص لوگوں سے تقاضا نہیں کرتا۔ سچائی کے پھل کا انتظار کرتا ہے۔ صبر اور استقامت سے۔

☼ ☼ ☼

آسیہ بیگم دیکھ رہی تھیں، سوچ رہی تھیں اور موازنہ کر رہی تھیں۔ اساور کھوئی کھوئی رہتی، اجڑی صورت پریشان آنکھیں، الجھا انداز، چڑچڑا لہجہ۔ بریرہ خوش رہتی، مزید کھلی کھلی، وہ اگر کندن تھی تو اسفندیار

کی محبت اور توجہ نے اس کے چہرے پہ گلاب کھلا دیے تھے۔ وہ اگر سہانا موسم تھی تو اسفندیار کی چاہتوں اور مان نے اس کے چہرے کو دھنک رنگ سے سجا دیا تھا۔ بریرہ کو محبت نے اعتماد دیا تھا۔ اساور کو محبت نے کنگال کر دیا تھا' فقیر کر دیا تھا۔ وہ اساور جسے کبھی غصہ آتا ہی نہ تھا' اب غصہ اور جھنجلاہٹ اس کا وطیرہ بنتے جارہے تھے۔ وہ تنگ مزاج' چڑچڑی اور بدلحاظ ہوتی جارہی تھی۔ بریرہ اس کی لاڈلی بہن تھی' وہ مر کر بھی اس سے حسد نہیں کر سکتی تھی' لیکن اس کے چہرے پہ پھیلی شفق ایک بار ضرور اساور کو آئینہ دیکھنے پہ مجبور کرتی تھی اور وہ ہر بار آئینہ دیکھ کر پچھتاتی تھی۔

آسیہ بیگم کا گمان تھا کہ شاید رخصتی میں تاخیر کی وجہ سے وہ چڑچڑی ہورہی ہے کیونکہ سال پورا ہوچکا تھا' لیکن اساور کے سسرال والے رخصتی کے معاملے پر سنجیدہ نہیں ہورہے تھے۔ دونوں بہنوں کی اکٹھی رخصتی والی شرط کی وجہ سے بریرہ کے سسرال والے بھی اب تقاضا کرنے لگے تھے' لیکن اس وقت آسیہ کسی اور ہی نہج پر سوچ رہی تھیں۔ اسی سوچ کے تحت انہوں نے نجم صاحب سے مشورہ کیا۔

"بریرہ ابھی چھوٹی ہے' اس کی رخصتی ذرا لیٹ ہو بھی جائے تو وہ محسوس نہیں کرے گی' لیکن اساور کے ساتھ یہ زیادتی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں عالیہ بیگم سے دو ٹوک بات کی جائے۔" نجم صاحب کی حمایت پر انہوں نے اسی وقت اساور کی ساس کو کال ملائی' لیکن رخصتی کی بات کرنے پر عالیہ بیگم نے ان پر دھماکا ہی کر ڈالا۔

"کیسی باتیں کررہی آپ آسیہ۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سلمان کی جاب ختم ہوگئی ہے۔ دن بھر تو وہ اساور کے ساتھ فون پر بزی رہتا ہے' کیسے ممکن ہے کہ اس نے بتایا نہ ہو۔ ایسے میں رخصتی لینا تو بنتا ہی نہیں۔ نہ سلمان ایگری ہے اور نہ ہی علیم یہ بات پسند کریں گے کہ سلمان کے ساتھ ساتھ اس کی وائف بھی ہم پر ڈیپنڈنٹ ہوجائے۔ ہر کسی کی اپنی لائف ہے اپنے پرسنل ایکسپینس ہیں۔ آج کے دور میں کوئی کسی کو سپورٹ نہیں کر سکتا۔" وہ آخر این جی او کی ڈائریکٹر تھیں۔ ایسی نان اسٹاپ مدلل تقاریر میں مہارت رکھتی تھیں۔ وہ اور بھی بہت کچھ بول رہی تھیں جو آسیہ بیگم ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ سنتے جارہی تھیں۔ اساور کے چہرے پر چھایا اضمحلال اور رنگت میں کھلی سرسوں اب کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ آسیہ بیگم کو بہت کچھ غلط ہونے کے اشارے مل رہے تھے۔

ہاتھ زخمی ہوئے کچھ اپنی خطا تھی شاید
میں نے قسمت کی لکیروں کو مٹانا چاہا

☼ ☼ ☼

اس روز وہ سعیدہ کے ہاں ڈنر پر انوائٹڈ تھے۔ کتنے عرصے سے پریشانیوں کے گھیرے میں پھنسے وہ لوگ کہیں نہ نکلے تھے۔ سعیدہ نے فون کرکے دعوت دی تو آسیہ بیگم کو قفس میں روزن کا سا احساس ہوا۔ بوجھل دل و دماغ کو تھوڑی دیر تازگی کا غسل دینا بہتر تھا۔ انہوں نے خوش دلی سے دعوت قبول کی اور اساور اور بریرہ کو تیاری کا کہہ دیا۔ اساور کو شروع ہی سے اپنی سعیدہ پھپھو اور ان کے گھر کا ماحول بے حد پسند تھا۔ اپنی ماں کے خیالات کے برعکس اسے کبھی ان کا ماحول گھٹن زدہ نہیں لگا تھا۔ وہ ان کی اقدار کی قدر دان تھی۔ ان کی بچیوں کے حجاب میں لپٹے معصوم چہرے اسے بہت بھلے لگتے تھے۔ عمر' ان کا اکلوتا بیٹا تھا' لیکن اکلوتا ہونے کے باوجود بگڑے مزاج کا نہیں تھا۔ سلجھا ہوا' سوبر اور سنجیدہ۔ سلام دعا سے زیادہ اس نے کبھی ان لڑکیوں سے بات چیت نہ کی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ ہی بیٹھتا تھا حالانکہ اساور کے حسن کے آگے بڑے بڑے پانی بھرتے تھے' لیکن وہ عمر تھا۔

مجموعی طور پر ان کے گھر کا ماحول اس قدر اپنائیت بھرا اور کمفرٹیبل ہوتا تھا کہ اساور اپنا کوئی ہم عمر کزن نہ ہونے کے باوجود بھی وہاں سکون محسوس کرتی تھی۔ سو وہ بہت دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ ڈارک سی گرین لانگ شرٹ کے ساتھ وائٹ ٹراوزر اور دوپٹا لیے'

میچنگ وائٹ سینڈل پہنے' نیچرل سا میک اپ کیے جب وہ کمرے سے نکلی تو لاؤنج میں تیار کھڑی آسیہ بیگم نے پرس کی زپ بند کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر... عرصے بعد اسے یوں تیار فریش دیکھ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے چہرے پر چاندنی کی مانند پھیلا سکون و اطمینان ان کے اپنے دل میں شانتی کی سبز چادر پھیلا گیا۔ ماں باپ ان کے دل میں اترنے والا سکون بھی ان کی اولاد کے چہرے کی مسکان سے مشروط ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے لیے مسکرانا تو وہ کب کا چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی یہ جان لیتی کہ سکون کے یہ پل چند گھنٹوں میں کسی چیز میں بدلنے والے ہیں تو وہ گھر سے باہر ہی نہ نکلتیں' لیکن یہ لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہے جس کی بدولت ہم چند پل تو سکھ کے گزار ہی لیتے ہیں۔ اسی لاعلمی کے عطا کردہ سکون کے زیر اثر انہوں نے سعیدہ کے گھر قدم رکھا تھا۔ آسیہ بیگم سعیدہ کے ساتھ کچن میں ہی چلی گئیں۔

نجم اور شہزاد صاحب عمر سمیت لاؤنج میں محفل جما کر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کو نمرہ اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ نمرہ' ثمرہ اور بریرہ اپنی خوش گپیوں میں مگن تھیں۔ حمرہ کمپیوٹر پر کوئی ورڈ پزل کھیل رہی تھی۔ اساور سکون سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اس کی گیم دیکھنے لگی' ساتھ ساتھ اسے ہنٹ دیتی جا رہی تھی۔ حمرہ اس کی دلچسپی سے بہت خوش ہو رہی تھی۔

عین اسی وقت پاس پڑا اس کا موبائل بجنے لگا۔ وہ ٹھرا اٹھی۔ دیکھے بنا بھی وہ جانتی تھی یہ کال سلمان ہی کی تھی۔ اس کی رنگت لمحوں میں سفید پڑی تھی۔ حمرہ کی اس کی جانب پشت تھی۔ باقی بھی کسی کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا' وہ ٹون سائلنٹ پہ کرتی اٹھ کر باہر نکلی تو لاؤنج میں بیٹھے عمر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف لپکی۔ کچھ تھا اس کے چہرے پہ جو عمر اس کے چہرے سے نظر ہٹا نہیں سکا تھا۔ اساور کی اڑی رنگت' عجلت اور ہاتھ میں دبا موبائل' وہ الجھ سا گیا۔ کال بس بند ہونے والی تھی جب اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی ریسیو کرلی۔

"کہاں تھی اتنی دیر سے؟" وہی مزاج۔

"سلمان میں سب لوگوں کے بیچ بیٹھی تھی' اٹھ کر سائڈ پہ آنے میں ٹائم لگا۔" یوں ہی فضول وضاحتیں دینی پڑتی تھیں سلمان کو۔ ادھر اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیوں۔ کہاں ہو تم؟"

"سعیدہ پھپھو کے گھر۔" اور روانی میں کہہ کر وہ بے اختیار پچھتائی وہ یہ بھی تو کہہ سکتی تھی کہ گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں۔

"کس کی اجازت سے۔" سلمان کا لہجہ سرد ہوا۔

"فی الحال میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں سو ان ہی کی اجازت کی پابند ہوں۔" وہ چبا چبا کر بولی تو سلمان مزید بھڑکا۔

"محترمہ اساور سلمان صاحبہ آپ میرے نکاح میں ہیں اور دنیا کے کسی بھی کونے میں چلی جائیں آپ میری مرضی اور اجازت کی پابند رہیں گی۔"

"اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ رخصتی کروائیں اور پھر چلائیں اپنی مرضی۔" نجانے کیوں آج وہ دوبدو مقابلے پہ اتر آئی تھی اور یہ چیز اسے بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔

"میں تمہیں کئی دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ مجھے یہ آوارہ گردیاں ہرگز پسند نہیں ہیں۔ میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ ابھی اور اسی وقت اپنے گھر واپس جاؤ۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں تمہیں لینڈ لائن پر کال کرکے چیک کروں گا لہٰذا مجھ سے ڈرامہ بازی کرنے کا سوچنا بھی مت۔" اساور کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"سلمان پلیز یہ کیا بچپنا ہے۔ میں امی ابو کے ساتھ آئی ہوں' ہماری دعوت ہے یہاں' ابھی ڈنر بھی نہیں لگا' میں کیا کہہ کر واپس جاؤں۔ کچھ تو خیال کریں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میں کچھ نہیں جانتا' یہ تمہارا ہیڈک ہے۔ آدھے گھنٹے بعد میں کال کروں گا اور اگر گھر سے تمہارا لینڈ لائن پک نہ ہوا تو اسی وقت طلاق لکھ کر بھجوا دوں گا۔"

"سلمان....." اساور کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

اس نے فون بند کر دیا تھا۔ ضبط کی انتہاؤں کو جکڑے وہ ڈرائنگ روم سے نکلی اور سیدھی نجم صاحب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ عمر بری طرح چونکا۔ نجم صاحب بھی اس کا سفید چہرہ دیکھ کر پریشان ہوئے۔

"ابو... مجھے... گھر... جانا ہے... ابھی۔ اسی وقت۔" الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر لبوں سے آزاد ہو رہے تھے وہ خود کو رونے سے باز رکھنے کی کوشش میں ادھ موئی ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے۔" اسی لمحے برتنوں کی ٹرے اٹھائے آسیہ بیگم لاؤنج میں لگے ڈائننگ ٹیبل پر لگانے کے لیے آئی تھیں۔ اساور کی بات سن کر ان کے نقوش تن گئے۔

"میری طبیعت خراب ہو رہی ہے ابو پلیز..." وہ ہذیانی سی ہو رہی تھی' اس کی تیزی سے سفید پڑتی رنگت' بار بار گھڑی کو دیکھنا۔ عمر نوٹ کر رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے اساور یہاں ڈر لگنے لگا ہے' تمہارے تماشے قابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں۔" آسیہ بیگم کا ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔ سعیدہ نے ان کا بازو دبا کر حوصلہ دیا اور آگے آئیں۔

"اساور۔ میرا بچہ کھانا کھا کر چلی جانا۔ طبیعت خراب ہے تو کمرے میں لیٹ جاؤ میں ڈنر وہیں لگوا دیتی ہوں۔" بریرہ' نمرہ' ثمرہ' حمرہ سب ہی باہر آ گئی تھیں۔ اچھا خاصا تماشا کھڑا ہو گیا تھا۔ اساور نے گھڑی کو دیکھا' دس منٹ اسی میں لگ گئے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں اسے نیزوں جیسی لگ رہی تھیں' یکایک اس نے سعیدہ بیگم کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"پلیز پھپھو جانے دیں پلیز پھپھو۔" وہ بلک بلک کر رو دی۔ سب دم بخود رہ گئے۔ عمر سب سے پہلے اس ٹرانس سے نکلا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

"آپ لوگ بیٹھیں پلیز ماموں' ممانی ریلیکس' میں چھوڑ آتا ہوں اساور کو۔ چلیں پلیز۔" اس کے کہنے کی دیر تھی کہ اساور نے باقاعدہ گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک لمحے کو عمر گنگ رہ گیا۔ پھر اس نے چابی اٹھائی اور پورچ کی طرف بھاگا۔ کچھ تو تھا جو بے حد غیر معمولی تھا۔ ڈرائنگ روم میں فون پر بات کرتے ہوئے اس کی دبی دبی آوازیں باہر لاؤنج میں عمر نے سنی تھیں۔ پہلے درشت اور پھر روہانسا ہوتا لہجہ۔ وہ الجھے ذہن کے ساتھ انتہائی فاسٹ ڈرائیو کر رہا تھا کیونکہ وہ اساور کا بار بار گھڑی دیکھنا محسوس کر چکا تھا۔ پندرہ منٹ میں وہ گھر پہنچ چکا تھا۔ اساور جس طرح مخبوط الحواس ہو رہی تھی وہ اسے یوں گیٹ پر اتار کر نہیں جا سکتا تھا اس لیے اس کے ساتھ اندر لاؤنج تک چلا آیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سکون سے بیٹھ کر حواس قابو کر لے تو وہ واپس آ جائے گا لیکن ایک اور انہونی اس کی منتظر تھی۔ جب اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو لینڈ لائن فون بج رہا تھا۔ اساور اسے دھکیل کر بھاگتی ہوئی ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف گئی تو وہ حق دق رہ گیا۔

اساور نے بجلی کی سی تیزی سے ریسیور اٹھایا اور اس کے لبوں سے ادا ہوتے جملے نے عمر کو منجمد کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"مسلمان میں گھر آ گئی ہوں اب آپ پانچ منٹ بعد میرے موبائل پر کال کریں۔" ریسیور کریڈل پر پٹخ کر وہ بے دم سے پاس پڑے صوفے پر گر گئی۔ لاؤنج کے دروازے پر جمے کھڑے عمر کو لگا اب وہ کبھی ہل ہی نہ سکے گا۔ صوفے کی پشت پر سر گرائے آنکھیں موندے بیٹھی اساور نے کسی خیال کے تحت سر اٹھایا تو عمر کو یوں کھڑا دیکھ کر جیسے ہوش میں آئی۔

"اوہ... عمر بھائی۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی۔

"اساور۔" وہ مزید بول ہی نہ پایا۔

"وہ... عمر بھائی..." وہ شرمندگی میں غرق ہو گئی۔

"کبھی اپنا سمجھ کے بتایا تو ہوتا کہ آپ پہ کیا گزر رہی ہے؟" بے اختیارانہ کیفیت کے زیر اثر وہ جو کہہ گیا اسے خود بھی احساس نہ تھا۔ اس کی اساور سے بھلا کب ایسی بے تکلفی تھی جو وہ ایسی بات اس سے شیئر کرتی۔ اسی سوچ کے تحت حیران ہو کر اساور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور جیسے بے خود سی ہو گئی۔ کیا تھا عمر کی آنکھوں میں۔ وہ سمجھ نہ پائی۔ لیکن وہ اس کی آنکھیں پڑھ رہا تھا۔ کسی آسان سادہ کتاب کی طرح۔

دکھ، ملال، تکلیف، اذیت، ناقدری۔ اور بہت کچھ۔ جو عمر کو اپنے دل پر اترتا محسوس ہوا تھا۔ یکلخت وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور اساور پر نظر ڈالے بنا باہر نکل گیا۔

"مین گیٹ اچھی طرح بند کرلیں۔" اساور نے اس کی بات سنی تھی۔ آخری بات۔

☼ ☼ ☼
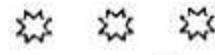
اور پھر اساور کی زندگی میں شامل عذابوں میں تواتر آگیا۔ اس پر اپنی سانسیں تنگ پڑنے لگیں۔ سلمان مینٹل ٹارچر کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے سزاؤں کا آغاز کردیا تھا اور اس کی سزائیں ایسی ہوتی تھیں کہ اساور بے اختیار خدا سے موت کی آرزو کرنے لگتی۔ دن بھر وہ اسے ننگے پاؤں انگاروں پہ چلاتا اور رات کو یہ انگارے تیزاب ملے لقموں کی مانند گویا اسے چبا کر حلق سے اتارنے ہوتے۔

وہ اسے راتوں کو باہر لان میں جاکر بات کرنے کا کہتا۔ دسمبر کی سرد ترین راتوں میں کئی کئی گھنٹے ٹھنڈ میں ٹہلنا خواہ کتنے بھی سویٹر اور شالیں لپیٹ لو۔ اور پھر وہ گردوپیش کی آواز سے اندازہ لگاتا کہ وہ واقعی باہر آئی ہے یا جھوٹ بول رہی ہے۔ کبھی اگر وہ بازار چلی جاتی اور اسے پتا لگ جاتا تو رات بھر جاگنے کی سزا دیتا۔

کال ملاتا، بات کرتا رہتا، کبھی خاموش بھی ہوجاتا لیکن اسے سونے نہ دیتا۔ گھنٹے بعد کال بند ہوتی تو پھر ملاتا۔ نیند بھگانے کے لیے اساور ٹہلنے لگتی، ٹہل ٹہل کر ٹانگیں شل ہوجاتیں تو بیٹھ جاتی، نیند کے جھٹکے آنے لگتے تو سخت زمین پہ بیٹھ جاتی، کمرے میں ہوتی تو کارپٹ پر بیٹھ جاتی۔ لیکن نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ وہ لڑھکنے لگتی۔ ایک بار نیند نے غلبہ پایا، فون ہاتھ سے لڑھک گیا۔ اس ظالم نے لائن کاٹ کر پھر ملایا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔

"اب اگر تمہاری آنکھ لگی تو لینڈ لائن پر کال کرکے پورے گھر کو جگادوں گا۔" وہ زہریلے انداز میں بولتا۔

وہ ڈر جاتی۔ پھر ٹہلنے لگتی۔ کمر اکڑ کر تختہ ہوجاتی، پاؤں دکھتے ہوئے پھوڑا بن جاتے۔ سردیوں کی راتوں میں یوں جاگ جاگ کر اس کی طبیعت بگڑ جاتی۔ اسے لگتا وہ مرجائے گی، دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ نہ وہ مرتی نہ وہ ظالم ظلم سے چوکتا۔ گھر والوں کو کچھ خبر نہ تھی۔

ان ہی بوجھل دنوں میں بریرہ کی ساس نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے رخصتی کی تاریخ مانگی تو نجم صاحب اور آسیہ بیگم چاہ کر بھی انکار نہ کرسکے۔ یوں ایک ماہ بعد کی ڈیٹ فکس کردی گئی۔ بریرہ کے نکاح کو بھی سال ہونے والا تھا جبکہ اس کی شادی چھ ماہ بعد ہی کرنے کا وعدہ ہوا تھا۔ لیکن اساور کی سسرال کے عجیب وغریب رویے کی بنا پر وہ مزید نہیں روک سکتے تھے۔ اساور دل سے خوش ہوتی اگر اس کی زندگی طوفانوں کی زد میں نہ ہوتی۔

نجم صاحب کے کان میں کچھ اڑتی اڑتی خبریں پہنچی تھیں۔ ان کے ایک جاننے والوں کا اساور کی سسرال میں کافی آنا جانا تھا۔ ان کی بیٹی اساور کی جٹھانی حریم کی کالج فیلو رہ چکی تھی۔ اس کے ذریعے ان تک خاصی تشویش ناک خبریں پہنچی تھیں۔ سلمان کے بڑے بھائی احسان کے اپنی بیوی حریم سے تعلقات کشیدہ ہوچکے تھے اور گمان غالب تھا کہ جلد ہی ان میں علیحدگی ہوجاتی۔ یہ بات وہ لوگ شروع سے جانتے تھے کہ حریم امریکہ میں سیٹل ہونا چاہتی تھی اس کی پرورش اور تعلیم بھی وہیں کی تھی، تو یہی بات ان کے مابین اختلاف کا باعث بنی اور بڑھتے بڑھتے علیحدگی کی نوبت آگئی۔ حریم نے مزید بتایا تھا کہ علیم صاحب اور عالیہ بیگم کے بیچ بھی اول روز سے انڈر اسٹینڈنگ نہ تھی' ان کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے اور یہ سب گھر میں برملا ہوتا تھا۔ چونکہ وہ دونوں بزنس پارٹنرز بھی تھے اس لیے بمشکل تمام اپنی اپنی اغراض نے انہیں ساری عمر اس بندھن میں باندھے رکھا۔ دوسری طرف اساور کی اکلوتی نند نرمین جو کہ اسکن اسپیشلسٹ تھی' اس کے بھی اپنے شوہر سے اختلافات چل رہے تھے۔ اس کی اپنے شوہر سے لومیرج تھی اور دھواں دھار افیئر کے

بعد شادی کرکے اب اس کے شوہر کو اس پر اعتبار نہیں رہا تھا' کچھ وہ بھی آزاد روش اور فرینک طبیعت کی مالک تھی' ساتھی کولیگز سے حد درجہ فری تھی اور یہ بات شادی کے بعد اچانک ہی اس کے شوہر کو گراں گزرنے لگی تھی۔ حریم کی اطلاعات کے مطابق ان کا رشتہ بھی خطرے میں ہی تھا کیونکہ غلطی ہونے کے باوجود بھی نرمین اپنی غلطی ماننے اور جھکنے پر تیار نہ تھی۔ شاید ان ہی سب باتوں کی بنا پہ سلمان اس قدر تکلیف دہ عادات اور پیچیدہ شخصیت کا مالک بن گیا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود سلمان کی شخصیت میں موجود سقم ابھی نجم صاحب سے پوشیدہ ہی تھے۔ حریم نے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن اساور کی صلح جو فطرت کی بدولت سلمان کی شخصیت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا بہت جلد وہ انتہائی بدنما طریقے سے اٹھنے والا تھا۔ شاید ان ہی وجوہات کی بنا پہ سلمان کی رخصتی کے لیے کوئی بھی سنجیدہ نظر نہ آتا تھا۔

بریرہ کی ڈیٹ فکس ہونے پر ایک بار پھر اساور نے سلمان کو رخصتی کے لیے فورس کیا تھا اور ایک بار پھر اسے سزا کا شکار بننا پڑا تھا۔ یہ اسی رات کے بعد کی بات ہے جب فجر کی اذانوں کے ساتھ اس کی سزا ختم ہوئی تو وہ کارپٹ سے اٹھ کر بیڈ پر لیٹنے کے بعد قابل نہ رہی تھی' موبائل وہیں گرا اور وہ کارپٹ پر ہی بے سدھ ہوگئی۔ صبح آسیہ بیگم اسے جگانے آئیں تو اسے یوں پڑا دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ اسے آوازیں دیں تو وہ کسی چرسی کی طرح جھومتی ڈولتی اٹھی اور بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کے اٹھنے پر اس کے نیچے سے برآمد ہوتے موبائل کو دیکھ کر آسیہ بیگم کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

لیکن انہیں مہربہ لب ہونا پڑا۔ وہ بری طرح بخار میں تپ رہی تھی۔

آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے' بڑی بڑی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی' زرد گیندے سا کملایا مرجھایا چہرہ' بال جیسے گند کا ڈھیر۔ وہ بال جو ریشم کے لچھے تھے' جن میں کوئی پونی' کوئی کیچر نہ ٹکتا تھا نہ کوئی ہیئر اسٹائل بنتا تھا۔ وہی ریشمی لچھے اب سڑی ہوئی کھچڑی جیسے

ہو رہے تھے۔ کپڑے اس نے شاید ایک ہفتے سے نہ بدلے تھے جو ہر روز نت نئے ڈریسز پہنتی خوشبوؤں میں بسی رہتی تھی۔ وہ بری طرح تشویش کا شکار ہوئی تھیں۔ کچھ تھا جو بے حد غلط تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔

"کہاں غلطی ہوئی میرے مولا جو آج یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے؟" وہ اس کے سرہانے بیٹھی سسک اٹھیں۔ بعض دفعہ انسان قبر میں اتر جاتا ہے لیکن مرتے دم تک نہ تو اپنی غلطی سمجھ پاتا ہے نہ ہی سدھارنے کا موقع مل پاتا ہے۔ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ پہلی ٹھوکر پہ ہی اپنی غلطی ڈھونڈ کر اسے ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی توفیق کی بات ہے۔

انہوں نے نجم صاحب سے دوٹوک بات کی۔

"آپ ڈائریکٹ علیم بھائی سے بات کریں کہ طریقے سے رخصت کرا کے لے جائیں اساور کو۔ پھر بھلے سے سلمان اسے ساری رات جگائے یا سارا دن ستائے لیکن یہ روش درست نہیں۔ لمحہ لمحہ بے چاری کو اپنے ساتھ اٹکائے رکھتا ہے۔ حالت دیکھیں اس کی' کس قدر بدتر ہوگئی ہے۔"

نجم صاحب کے ماتھے پر تفکر بھری لکیروں میں چند مزید پریشان لکیروں کا اضافہ ہوا تھا۔ ان کے شانے جھکتے جا رہے تھے۔ بریرہ کی شادی کی تیاریاں عروج پہ تھیں اور اساور کے معاملات بگڑنے لگے تھے۔ لیکن جب علیم صاحب سے رابطہ کیا تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ سلمان نہ تو جاب کے لیے سنجیدہ ہے نہ رخصتی کے لیے لہٰذا اگر وہ چاہیں تو اساور کی طرف سے طلاق کا مطالبہ کردیں۔

نجم صاحب گنگ رہ گئے۔ ان کا بی پی شوٹ کر گیا۔ آسیہ بیگم کو انہیں سنبھالنا محال ہوگیا۔ وہ رات اساور پہ ایک بار پھر بھاری تھی۔ علیم صاحب کی سلمان سے اس معاملے پہ تلخ کلامی ہوئی تھی اور غبار اس نے اساور پہ نکالا۔ اس کی برداشت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ سے یہ سب کیوں چھپا رہی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں

شاید خاندان میں بدنامی کا خوف تھا' یا یہ خوش گمانی تھی کہ رخصتی کے بعد سب سیٹ ہو جائے گا۔ جو بھی تھا ٹھیک نہیں تھا۔

دانش کی جاب ابھی نئی نئی تھی اس لیے وہ گھر کم کم آتا تھا پھر جب سے بریرہ کی ڈیٹ فکس ہوئی تھی اس نے گھر آنا بند کر دیا تھا تاکہ شادی کے لیے اسے چھٹیاں لینے میں دقت کا سامنا نہ ہو۔ وہ بہت سی پریشانیوں سے بے خبر تھا۔ لیکن اس نہج پہ آ کر نجم صاحب نے اسے کال کر کے سب کچھ بتانا ضروری سمجھا۔ وہ اساور سے بے حد اٹیچ تھا اس کی پریشانی فطری تھی۔ نجم صاحب نے اسے اساور سے بات کرنے کے لیے کہا تھا۔ اساور کی ایسی حالت کے پیچھے انھیں کوئی طوفان چھپا نظر آ رہا تھا جو وہ چھپائے بیٹھی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس نے بتانا ہوتا تو بتا دیتی۔ لیکن نہیں بتایا تھا تو گمان غالب تھا کہ وہ دانش سے ضرور شیئر کر لیتی۔

لیکن.....

دانش نے کال بھی کی' پوچھ بھی لیتا۔

لیکن پوچھنے کی نوبت نہ آئی۔

اس رات وہ طوفان آیا جس نے ان کے گھر کی ایک ایک بنیاد دہلا ڈالی۔ اس رات کیا ہوا تھا؟

☼ ☼ ☼

شہر آزاد کو کھلتی ہوئی کھڑکی کی تھکن
میری آنکھوں کو بھگوتی ہوئی آوارہ ہوا
دوش دیوار پہ بیزار گھڑی کی ٹک ٹک
میرے انجام پہ روتا ہوا سانسوں کا ستار
ٹوٹی الماری میں بکھرے ہوئے چاہت کے نقوش
رقص کرتی ہوئی تنہائی کے پیاسے سائے
میں اکیلا ہوں مگر پھر بھی' اکیلا تو نہیں

"آج دل کیوں اداس ہے؟ مضمحل کیوں ہے؟ آج دل کا درد سہا کیوں نہیں جا رہا۔ آج دنیا بری کیوں لگ رہی ہے؟ کیا میری محبت بھی وصل سے مشروط ہے؟ نہیں۔ میرا دل گواہی دے گا کہ میری محبت سطحی نہیں۔ سطحی ہوتی تو دل کی بجائے دنیا گواہ ہوتی میری محبت کی۔ یا کم از کم وہ گواہ ہوتی۔ لیکن میرے خدا اور میرے دل کے سوا کوئی گواہ نہیں۔ میرے لیے اس کی خوشی مقدم ہے۔ وہ خوش ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ تو کیا۔ تو کیا وہ خوش نہیں ہے؟ کیا وہ دکھی ہے؟ کیا اس کا دکھ میرے دل کو چھو رہا ہے۔؟ ہاں یہی بات ہوئی۔ ورنہ آج کیوں۔ اچانک آج کیوں ایسی کیفیت ہونے لگی۔ کس سے پوچھوں۔ کیسے پوچھوں۔"

وہ بے بسی سے پین ڈائری کے بیچ رکھ کر اسی ڈائری پہ سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ محب تو تھا مگر وہ ایک بات سے بے خبر تھا۔ اور وہ یہ کہ محبت خواہ یک طرفہ ہو یا دو طرفہ' ایک ٹیلی پیتھی خود بخود تخلیق ہو جاتی ہے۔ اور اس ٹیلی پیتھی کا ربط اسے خبریں پہنچاتا تھا۔ اور آج تو اس کا اداس ہونا بنتا تھا نا۔

کیونکہ آج کی رات اس کی محبت پہ بہت بھاری تھی۔ آج کی رات کیا ہونے جا رہا تھا؟

☼ ☼ ☼

کچھ حقائق اگر نجم صاحب نے اسے بتائے تھے تو کچھ الجھی بکھری ٹوٹی پھوٹی کڑیاں بریرہ نے بھی اسے تھمائی تھیں جنہیں استعمال کرتے ہوئے اس نے کھوج لگائی تھی اور کڑیوں کو ملاتا تھا۔ دانش نے اساور کو کال کی تھی اور بریرہ کی رخصتی کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ بچپن کے قصے' آپس کی نوک جھونک' چھوٹی چھوٹی لڑائیاں۔ یہ پرانے کھاتے کھول کر وہ اساور کو یہ تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ وہ ناسٹیلجک ہو رہا ہے۔ یوں اساور کے دل کی پتھریلی ہو جانے والی زمین نم ہوئی اور وہ بھڑ کے بنا وہ سب کہہ ڈالتی جو سننا اور جاننا دانش کا مقصد تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی رہا تھا جب اچانک بیچ میں سلمان کی کال آنے لگی۔ عرصے بعد لاڈلے بھائی سے یوں بات کر کے وہ ذہنی طور پر بے حد سکون محسوس کرنے لگی تھی۔ لیکن سلمان کی مسلسل آتی کال۔ اسے جیسے ضد ہو گئی۔ چاہے آر ہو یا پار۔ آج اس کی کال نہیں لینی۔ وہ بات کرتی رہی لیکن دوسری طرف اس چیز سے بے خبر

دانش نے اساور کی توجہ بٹتی صاف محسوس کی تھی۔ سات آٹھ مرتبہ ٹرائی کرنے کے بعد سلمان نے لینڈ لائن پہ کال ملائی۔ ضد اور غصے کے باوجود اساور نے لینڈ لائن کی آواز گونجتی سنی تو اس کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ سردیوں کی راتوں میں خاموشی میں گونجنے والی بیل آسیہ بیگم نے بھی سنی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کال پک کرتیں اساور کو پک کرلینی چاہیے تھی۔ اسی سوچ کے تحت اس نے دانش کو کال بند کرنے کا کہا اور دروازے کی طرف بھاگی مگر دیر ہوچکی تھی۔ آسیہ بیگم فون پک کرچکی تھیں' اساور کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ وہ ہولڈ کروا کر مڑی تھیں۔ عجیب سا تاثر تھا ان کے چہرے پر۔

"سلمان کی کال ہے۔" اتنا ہی کہہ وہ کمرے میں چلی گئیں۔ سلمان کا موڈ انہیں بگڑا ہوا لگا تھا اور اساور کا چہرہ بھی خوف زدہ سا لگا۔ سو آج پہلی بار۔ کمرے میں آکر وہ دروازہ بند کرنے کی بجائے چھری رکھ کر دیکھنے لگیں۔ آج وہ سننا چاہتی تھیں کہ ان دونوں کے بیچ گفتگو کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ نجم صاحب نے چونک کر ان کی اس حرکت کو دیکھا پھر وہ بھی اٹھ کر ان کے پاس آکھڑے ہوئے۔ اساور بات کررہی تھی۔ سلمان دھاڑ رہا تھا۔

"کس کمینے سے بات کررہی تھی تم؟"

اساور کے دل میں غیض اور تنفر کا ابال اٹھا۔ چہرہ انگارہ ہوگیا۔

"اپنی زبان کو لگام دیں۔ میں اپنے بھائی سے بات کررہی تھی۔" اس کے ضبط کی طنابیں اس کے ہاتھ سے پھسلتی جارہی تھیں' سات آٹھ ماہ ہوگئے تھے اس یہ ٹارچر جھیلتے۔

"یہ کس قسم کے بھائی ہیں جو آدھی راتوں کو بہنوں کو فون کرتے ہیں۔" صحیح کہتے ہیں لوگ کہ سانپ کی قسمت میں وہ زہر کہاں جو رشتہ دار عداوت میں اگلتے ہیں۔ اساور کو اس سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ بیمار ذہنیت کا حامل تھا۔ وہ اساور کو بھی بیمار کررہا تھا۔ وہ چبا چبا کر بولی۔

"یہ ان شوہروں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں جو اپنی بیویوں کو ان کے ماں باپ کے گھر بٹھا کر ٹارچر کرتے ہیں اور اپنی بیمار ذہنیت کو تسکین پہنچاتے ہیں۔"

ادھر اگر سلمان اس کے لب و لہجے پر سن ہوا تھا تو ادھر چھری میں کھڑی آسیہ بیگم نے بے اختیار دروازے کا پٹ چھوڑ کر ہاتھ دل پر رکھ کر سانس روکی تھی یا شاید رکی سانس بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ کیا ہورہا ہے میرے مالک۔" انہوں نے تہ دل سے اس رب کو پکارا تھا جسے اکثر لوگ بری گھڑی میں ہی یاد کرتے ہیں۔ اساور کا جسم کپکپا رہا تھا' سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں' آنکھیں لہو ٹپکانے کو تیار تھیں' اس کی برداشت کی حدیں تمام ہو چاہتی تھیں۔ اس نے بساط سے بڑھ کر خود پر جھیلا تھا یہ عذاب۔

"کس کی ایما پر اتنا بول رہی ہو تم۔ ابھی تین لفظ منہ پر ماروں گا تو سارا غرور و طنطنہ دھرا رہ جائے گا۔ تم ہو کیا چیز۔؟" اور بس.... بس ہوگئی تھی۔ اساور حلق کے بل چلائی۔

"ہاں ہاں دو مجھے طلاق ابھی اور اسی وقت۔ جان چھوڑو میری۔ معاف کرو مجھے۔ دو مجھے طلاق۔ دو نا۔ بولتے کیوں نہیں۔؟" وہ ہذیانی ہورہی تھی۔ آسیہ بیگم دوڑ کر اس تک آئیں ریسیور ہاتھ سے لے کر کریڈل پر پٹخا اور مڑ کر اسے دو تھپڑ لگانا چاہتی تھیں لیکن۔ وہ تیورا کر کارپٹ پر گری اور ساکت ہوگی۔

★ ★ ★

زندگی مجھ کو بتا
کسی گناہ کی ہے سزا؟

وہ ساکت بنجر نگاہیں چھت پر گاڑے لیٹی تھی۔ کسی بھی احساس سے عاری' خالی خالی ویران آنکھیں' جو ایک نظر دیکھے تو رو پڑے۔ پہلو میں دھرے ساکت ہاتھ کی پشت پہ لگے کینولا سے جڑی ڈرپ سے قطرہ قطرہ زندگی کی رمق اس کی رگوں میں دوڑانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس کے ساکت وجود کو اٹھ کر حرکت کرنے کی طاقت دینے کی کوشش کی جارہی تھی لیکن وہ خود' نفسیاتی طور پر آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔

زندگی نے اس سے اپنی تمام تر رعنائیوں کا بدلہ سود سمیت وصول کرلیا تھا جو کبھی اس نے گزاری تھی۔ زندگی نے اسے دکھادیا تھا کہ دیکھو میرا ایک چہرہ یہ بھی ہے۔ کسی بھول میں نہ رہنا۔

اسپتال کے پرائیوٹ روم میں ایک طرف رکھے بینچ پہ آسیہ بیگم آنسوؤں سے تر چہرہ لیے بیٹھی تھیں۔ دانش اور بریرہ ایک طرف مغموم سے کھڑے تھے۔ نجم صاحب ڈاکٹر سے بات کرنے نکلے تھے۔ دانش کو ایمرجنسی میں بلوایا گیا تھا۔ اساور کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا لیکن بروقت ٹریٹمنٹ سے اب اس کی حالت خطرے سے باہر تھی تاہم ڈاکٹرز نے مزید دو روز اسے انڈر آبزرویشن رکھنے کا کہا تھا۔ وہ ہوش میں آچکی تھی لیکن کسی سے بھی بات نہیں کرتی تھی۔ نجم صاحب کو احساس جرم مارے دے رہا تھا۔

دو کٹھن دن مزید اسپتال میں گزار کر جب وہ لوگ گھر پہنچے تو نجم صاحب اساور کو یک دم گلے لگا کر بھینچ لیا۔ اور بس۔۔۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے اور اساور بکھر بکھر کے رودی۔ اس کا رونا ایسا دل دہلانے والا تھا جیسے کوئی قریبی عزیز فوت ہوگیا ہو۔ جیسے جسم کو کانٹوں پہ گھسیٹا جارہا ہو' اور ایسا ہی حال تو ہوا تھا اس کا۔ سلمان نے اس کی روح کو کانٹوں پہ گھسیٹا تھا۔ اس کی انا کو کند چھری سے زخمی کیا تھا۔ رو رو کے اس کا پورا چہرہ سوج گیا۔ وہ اسے سنبھال سنبھال کر تھک گئے اس کے آنسو پونچھ پونچھ کر آسیہ بیگم کا دوپٹا بھیگ گیا لیکن اس کے آنسو نہ تھمے۔ اس نے سب کو رلادیا۔ سال بھر کا غبار تھا۔ موسلادھار بارش کے بنا کیسے تھم جاتا۔ ان کے گھرانے پہ ایک اور بھاری دن طلوع ہوا تھا۔ اشکوں بھرا۔ پچھتاووں بھرا۔ آج نجم اور آسیہ کو ہر وہ پرپوزل یاد آرہا تھا جو اساور کے لیے آیا تھا اور ریجیکٹ ہونے کے بعد جہاں جہاں بھی ان کی شادیاں ہوئیں وہ سب ہی خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے بچوں والے تھے۔ ہر فرد کے اشکوں کی مختلف وجوہات تھیں۔ دکھ' اداسی' پچھتاوے' احساس زیاں۔

اور پھر جب اساور کے آنسو ذرا تھمے تو اس نے ایک ایک لفظ کہہ سنایا۔ ہر بات بتائی' ہر اذیت اپنا دل کھول کے دکھادیا۔ وہ سب صدمے سے گنگ تھے' الفاظ گم تھے' حواس سلب تھے۔ آسیہ بیگم نے تڑپ کر اسے گلے لگایا۔

"میری شہزادی بیٹی' میری لاڈوں پلی گڑیا' میرا بچہ سب کچھ تنہا اپنی ذات پہ سہتی رہی بیٹا مجھے تو بتایا ہوتا' کبھی کوئی اشارہ ہی دیا ہوتا بیٹا۔" ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"کیا کہتی امی۔ کہ آپ کی لاڈوں پلی بیٹی سے زندگی کا سب سے اہم رشتہ ہی نبھایا نہیں جارہا۔ میں آپ کی تربیت آزما رہی تھی امی آخری حد تک' میں نے بہت کوشش کی امی۔ بہت۔۔۔"

اس کے لہجے میں اس قدر بے بسی تھی کہ ان سب کے دل کٹ کے رہ گئے۔ نجم صاحب طیش سے مٹھیاں بھینچنے لگے۔

"وہ گھٹیا انسان میری بیٹی کو اس قدر ٹارچر کرتا رہا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ ہم یہاں رخصتی پہ زور دیتے رہے وہ تو رخصتی سے قبل ہی اس کا جینا دوبھر کیے ہوئے تھا۔ بعد میں تو وہ اسے نوچ کے کھاجاتا۔ اور وہ اس کا نام نہاد عزت دار باپ۔ ان سب کا تو حشر کردوں گا' میں۔ کورٹ میں گھسیٹوں گا۔ ناک رگڑواؤں گا۔ ایسا بے عزت کردوں گا کہ ساری عمر منہ چھپاتا پھرے گا۔" آسیہ بیگم دہل گئیں۔

"اسے کورٹ میں گھسیٹیں گے بدنامی کے چھینٹے ہماری بیٹی کا دامن بھی آلودہ کریں گے۔ آپ خود جج ہیں بہتر سمجھتے ہیں کورٹ کے ماحول کو۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ مرد کا معاشرہ ہے' یہاں ہر صورت الزام عورت کے ہی سر آتا ہے۔"

ان کی بات تو تلخ تھی مگر سچ تھی۔ نجم صاحب خاموش ہوگئے۔ پھر ایک ہفتے کے اندر اندر انہوں نے اساور کی طرف سے سلمان کو خلع کا نوٹس بھجوادیا۔ سلمان کی طرف سے بھی جلد ہی طلاق کے کاغذات موصول ہوگئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ معاملہ طول پکڑ

جائے گا' ایسا کچھ بھی نہ ہوا حتی کہ ایک فون کال تک نہ آئی اور سال بھر کا تکلیف دہ بندھن دنوں میں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

جو سنتا دنگ رہ جاتا۔ بریرہ کی رخصتی میں محض پندرہ روز باقی تھے۔ اس کے سسرال والے "فوراً" آئے۔ مسٹر اینڈ مسز مسعود لغاری کے ہمراہ اسفندیار اور رامین بھی تھے۔ رامین دو روز قبل ہی کینیڈا سے بھائی کی شادی اٹینڈ کرنے آئی تھی' اس کے شوہر نے عین وقت پر ہی آنا تھا۔ اساور کی طلاق کا سن کے وہ سب ہی چلے آئے۔

نجم صاحب اور آسیہ بیگم جوان کے رد عمل سے دل ہی دل میں خوف زدہ سے تھے' یوں پوری فیملی کو آتا دیکھ کے مزید پریشان ہو گئے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان کا رد عمل کافی مثبت تھا۔ شاہانہ بیگم نے پہلے آسیہ کو دیر تک گلے لگائے رکھا پھر اساور کو بلوا کر اسے بازوؤں کے حلقے میں لیے بیٹھی رہیں۔ ایک بار پھر سب آبدیدہ ہو گئے۔ رامین نے بریرہ کو اپنے ساتھ بٹھالیا' وہ بھی رو رہی تھی' رامین مسلسل اسے تسلیاں دیتی رہی۔ ان کی یوں آمد کا مقصد بھی سامنے آگیا تھا۔ مسعود لغاری صاحب نے سمجھ داری اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے بریرہ کی رخصتی کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کرنے کا فیصلہ سنایا جب تک اساور جذباتی طور پر بہتر نہ ہو جاتی۔ اساور کے جذبات کا اس حد تک خیال کرنے پر وہ سب دل سے ان کے ممنون ہو گئے۔ نجم صاحب نے رسماً" انکار بھی کیا اور یہی کہا کہ رخصتی مقررہ وقت پر ہی ہو گی لیکن مسعود صاحب نے انہیں ٹوک دیا۔

"جیسے رامین ہماری بیٹی ہے ایسے بریرہ کے ساتھ ساتھ اساور بھی ہماری بیٹی ہے۔ اور ہمارے لیے بیٹیوں کے جذبات بیٹوں سے زیادہ مقدم ہیں۔ آپ کچھ برا محسوس نہ کریں۔ اسفندیار کی مرضی سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ کو جب سہولت ہو آپ ہمیں بتا دیجیے گا۔" اساور کے سسرال سے جتنی اذیت ملی تھی بریرہ کے سسرالیوں نے ایک ہی ملاقات میں اس کا کافی حد تک مداوا کر دیا تھا۔ وہ جو بریرہ کی آئندہ زندگی کے حوالے سے خدشات کا شکار ہو چلے تھے' اب کافی پرسکون ہو گئے۔

دانش نے اساور کے موبائل سے وہ سم نکال کر ضائع کر دی اور اس میں نئی سم ڈال کر اساور کو موبائل تھمایا تو اس نے نفرت سے موبائل پرے پھینک دیا۔ دانش دکھ سے مسکرا دیا۔ رشتے داروں کا تانتا بندھ گیا' افسوس کے لیے آتے' کریدتے' ہمدردیاں جتاتے اور کھا پی کر چلے جاتے۔ یہ سب اساور کی تکلیف کو بڑھا دیتا تھا۔ اس روز بھی ایسی ہی ایک فیملی کے جانے کے بعد اساور اشک بھری آنکھیں لیے بیٹھی تھی جب دانش اس کے پاس آبیٹھا۔

"اساور۔ جتنا جلد ہو سکے خود کو سنبھالو۔" اس نے نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے تو وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"تمہارے بھرم کی جو کرچیاں بکھری ہیں انہیں خود اپنے ہاتھوں سے سمیٹو' پھر چاہے انگلیاں کتنی بھی فگار ہوں وہ دنیا والوں کو مت دکھانا' دنیا یوں بھی چہرہ دیکھتی ہے' ہاتھ ٹٹول کر زخم صرف اپنے تلاشتے ہیں اور ان پر مرہم لگاتے ہیں۔ دنیا والے آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے ہمدردی جتاتے ہیں اور دوسروں کے پاس بیٹھ کر آپ کے بھرم کی دھجیاں تقسیم کرتے ہیں۔ جتنی کرچیاں بکھرنی تھیں بکھر گئیں' باقی سمیٹ لو۔ اس سلسلے کو اب رک جانا چاہیے۔ دنیا والے محبت جتا کر بجھی راکھ میں دبی چنگاریاں کھرچ کھرچ کر نکالتے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ عمل تکلیف دہ ہے۔ لیکن ہم انہیں ٹوک نہیں سکتے' ورنہ وہ ان ہی چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلہ بنا دیں گے۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔" اور اساور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جن جن لوگوں نے کبھی اساور کا رشتہ مانگا تھا وہ بطور خاص آتے اور سارا معاملہ سن کر ہمدردی جتا کر آخر میں اپنی بہوؤں کی باتیں شروع کر دیتے اور بڑھا چڑھا کر بتاتے کہ کس طرح انہوں نے اپنی بہوؤں کو ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا ہوا تھا۔ کہنے والوں کی زبانیں بھلا کب

رکی ہیں' یہ تک کہا گیا کہ اب تو اساور کو رنڈوا یا بچوں والا ہی قبول کرے گا۔ جنہوں نے کبھی اساور کا رشتہ مانگا تھا ان میں سے کچھ لڑکے اب بھی کنوارے تھے لیکن اب وہ بھلا کیوں اساور کو مانگتے۔ اور اب نجم صاحب شدت سے خواہاں تھے کہ ان میں سے کوئی بھی اساور کا رشتہ ایک بار پھر مانگ لے۔ لیکن اپنے منہ سے کسی کو کہنا اپنا تھوکا ہوا چاٹنے کے مترادف تھا۔ وہ ساری ساری رات اس سوچ میں جاگتے گزار دیتے کہ اب ہو گا کیا۔

☆ ☆ ☆

ان ہی دنوں آسیہ بیگم کے بھائی بھابھی رؤف اور نجمہ اور چھوٹے بھائی بھابھی منور اور سلمیٰ نے اپنے بڑے بیٹوں علی اور اظفر کے رشتے پکے کر دیے۔ سب جانتے تھے کہ نجمہ بیگم نے اپنی نند آسیہ بیگم کو دکھانے کے لیے ایسا کیا کیونکہ علی اور اظفر دونوں کے لیے آسیہ بیگم نے انکار کیا تھا۔ رؤف اور منور نے بھی اکلوتی بہن کے جذبات کا لحاظ نہ کیا اور بات پکی ہونے کی مٹھائی خاندان بھر میں بانٹی۔ لڑکیاں بھی نجمہ نے اپنے میکے سے پسند کی تھیں۔ علی کی منگیتر ثوبیہ اور اظفر کی منگیتر ثومیہ دونوں نجمہ سلمیٰ کی چھوٹی بہن سمیعہ کی بیٹیاں تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اتفاق و محبت کی مثال قائم کرتے ہوئے نجمہ بیگم نے دونوں لڑکیاں اپنی بہویں بنانے کی بجائے ایک لڑکی سلمیٰ کو بہو بنانے کے لیے کہا۔ یوں یہ رشتے طے پا گئے۔

ان کے چھوٹے بھائیوں خالد اور شاہد کی بیویاں فائزہ اور شازیہ مبارکباد دینے آئی تھیں۔ فائزہ نے دبے لفظوں میں اعتراض کیا۔

"آپا ابھی تو اساور کا معاملہ تازہ تھا آپ کو یوں مٹھائی نہیں بانٹنی چاہیے تھی۔" نجمہ بیگم تو تڑپ اٹھیں۔

"ارے تو کیا ان کی خاطر ہم اپنے بیٹوں کی خوشیاں نظر انداز کر دیں۔ ان کا تو اپنا کیا ہی سامنے آیا ہے۔ بڑا غرور تھا ان کو اپنی بیٹی کی خوب صورتی اور اپنی مالی حیثیت پہ۔ ہمارے بیٹوں کے لیے کیسی نخوت سے انکار کیا تھا آسیہ آپا نے۔ آج پچھتا رہی ہیں۔"

"ایسا تو نہ کہیں آپا۔ بے چاری دکھی ہیں۔" سلمیٰ دہل گئیں۔

"ارے تو کیا غلط کہا میں نے۔ ایک سے ایک اونچے رشتے کے چکر میں کیسے کیسے ہیرا لڑکے گنوائے انہوں نے۔ ہمارے بیٹوں کو چھوڑو۔ اور بھی بہت تھے۔ مگر انہیں تو پیسہ' اسٹیٹس' شان و شوکت درکار تھی۔ نکاح پہ بھی کیسا پانی کی طرح پیسہ لٹایا تھا۔ اتنا بے جا اسراف اللہ کو بھی پسند نہیں۔ اور اللہ کو ناراض کر کے قائم کیا جانے والا رشتہ بھلا خوشی دے سکتا ہے؟ سعیدہ بھابھی کتنا صحیح کہتی تھیں۔ سچ کہوں تو ہم نے ہمیشہ ہی سعیدہ بھابھی کی۔ باتوں کا مذاق اڑایا لیکن اب سوچوں تو احساس ہوتا ہے کہ سعیدہ بھابھی کبھی ان خرافات میں نہیں پڑیں اور دیکھ لو کتنا سکون ہے ان کے گھر میں۔ ان کی ثمرہ کو بہو بنا کے ہمارے گھر میں بھی وہی سکون اتر آئے گا۔ اس وقت تو یہ نہیں سوچا لیکن اب آسیہ آپا کا انجام دیکھ کر سوچتی ہوں سعیدہ کا عمل بہترین تھا۔ ہمیں بھی دین کے طریقوں کو اپنا لینا چاہیے۔ آخر جانا تو اسی اللہ کے پاس ہے۔ پھر دنیا اور اس کے طور طریقوں نے تو نہیں بچاؤ کرنا ہمارا۔"

نجمہ بیگم کا حرف حرف سچائی میں ڈوبا تھا۔ سعیدہ بیگم نے نہ کبھی کسی کو ٹوکا نہ وعظ و نصیحت کی۔ وہ یہی کہا کرتی تھیں کہ انسان کو اپنا اعمال نامہ ستھرا رکھنا چاہیے' اور آج ان کا خاموش عمل سب ہی کو احساس دلا رہا تھا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ نجمہ اور سلمیٰ ثمرہ کی دفعہ چاہ رہی تھیں کہ منگنی کا اچھا سا فنکشن رکھا جائے۔ لیکن سعیدہ بیگم نے مخالفت کی اور مجبوراً انہیں سادگی سے انگوٹھی پہنانی پڑی۔ نجمہ بیگم سخت برگشتہ تھیں اور عین ممکن تھا کہ شادی تک یہ بدگمانی بڑھ کر نفرت میں بدل جاتی لیکن اس سے پہلے ہی شہزاد صاحب نے رازداری کا وعدہ لے کر بہنوں کو سعیدہ کی مخالفت کی اصل وجہ بتا دی۔ سعیدہ نے منگنی کے جوڑے' ہال اور ڈنر کے خرچے اور دیگر ممکنہ خرچوں کا تخمینہ لگا کر وہ رقم نکالی اور اس میں سے احمر کو منگنی کے

نام پر دیے جانے والے تحائف کی رقم الگ کر کے باقی رقم ایک مستحق لڑکی کی شادی کے لیے ادا کر آئیں۔ اللہ کی رضا کے لیے انسان ایک قدم اٹھاتا ہے تو اللہ پاک منزل کو جاتا اس کا پورا راستہ ہی سہل بنا دیتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

پوچھنے والے
تجھے کیسے بتائیں آخر؟
دکھ عبارت تو نہیں جو تجھے لکھ کر بھیجیں
یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تجھ کو
زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دیں
آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو
یہ کوئی راز نہیں جس کو چھپائیں تو وہ راز
کبھی چہرے کبھی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
جیسے آنچل کو سنبھالے کوئی اور تیز ہوا
جب بھی چلتی ہے تو شانوں سے ڈھلک جاتا ہے
اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں دکھ کیا ہے؟

لوگ بہت کچھ کہہ رہے تھے اور وہ سنتا تھا اور دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب ڈوب جاتا۔ وہ وہی رات تھی' بالکل وہی رات جب اس کے وجود پہ بے معنی سی اداسی چھائی تھی جب اس کا دل دکھ کے گھر میں لپٹا ہوا کرلا رہا تھا اور وہ اپنے دل کی ٹیلی پیتھی کے رموز سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ وہی رات تھی جو اس کی محبت پہ بھاری گزری تھی۔ اسی رات وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو کر اسپتال جا پہنچی تھی۔ کیا گزری تھی اس کے نازک دل پر' وہ چاہ کر بھی جان نہیں سکتا تھا۔ کس سے پوچھتا' کیسے پوچھتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ جا کر اس کی پلکوں کے آنسو سمیٹ کر اپنی آنکھوں میں بھر لیتا۔ اس کے دل میں بھرے دکھ کے طوفان کسی غیر مرئی طاقت کے ذریعے کھینچ کر سمندروں کے حوالے کر دیتا۔ اسے اتنی خوشیاں دیتا کہ اس کا دامن تنگ پڑ جاتا اس سے سنبھالنا مشکل ہو جاتیں' اسے اتنے سکھ دیتا کہ وہ دکھوں کا سامنا کر کے بھی ہنستی مسکراتی ہی رہتی۔ لیکن اس کے بس میں ہوتا تب نا۔ وہ راتوں کو سو نہیں پا رہا تھا ان سب اذیتوں کی داستانیں سن سن کر۔ کتنے دن کتنی راتیں اس نے اس کے دکھ میں بے کل گزاریں اور اس پری وش کو خبر بھی نہ تھی کہ کوئی اس کے لیے یوں بھی تڑپتا ہے۔ اس نے مرد کا جو روپ دیکھ لیا تھا سہ لیا تھا اس کے لیے وہی بہت تھا۔ وہ بے کلی کی انتہاؤں پہ تھا۔

کیسے اسے دیکھوں' کیسے اس کا درد بانٹوں' کیسے اسے دکھوں سے دور کروں۔ دل ایک راہ دکھاتا تو تھا' لیکن دماغ انکاری تھا۔ وہ سمجھے گی میں اس پر ترس کھا رہا ہوں۔ وہ اپنی ہی تجاویز رد کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

تین سیڑھی اوپر کھڑی بطخ اپنے درجن بھر بچوں کو اپنے تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں پھلانگنے کی لگن میں مگن دیکھ رہی تھی۔ بچے چھلانگ مارتے پھر لڑھک جاتے پھر اٹھتے پھر اچھلتے پھر گرتے' بطخ کسی قسم کی مدد کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔ بطخیں یوں ہی اپنے بچوں کی تربیت کرتی ہیں' خود اپنے زور بازو پر کوشش کر کے ہدف تک پہنچنا ہے خواہ ہزاروں بار گرنا پڑے۔

یہ مت کہو خدا سے میری مشکلیں بڑی ہیں
یہ مشکلوں سے کہہ دو میرا خدا بڑا ہے

اساور لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نظریں جمائے پلک جھپکے بنا وہ ویڈیو دیکھ رہی تھی جو دانش نے اس کے فیس بک ٹائم لائن پہ اسے ٹیگ کر کے شیئر کی تھی۔

آتی ہیں آندھیاں تو کر ان کا خیر مقدم
طوفاں سے ہی تو لڑنے خدا نے تجھے گھڑا ہے

بطخ کے بچے ایک ایک کر کے سیڑھیاں پھلانگتے جا رہے تھے اور اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے ہر بچہ سیڑھی چڑھتا ویسے ویسے اساور کی آنکھوں سے بہتی لڑیوں میں روانی آتی۔ آسیہ بیگم اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں اور پھر وہ بھی اسکرین پہ چلتا منظر دیکھ کر پس منظر میں چلتے گیت کو سن کر ٹھہر گئیں۔ دونوں کے دلوں پر یہ گیت ایک سا اثر کر رہا تھا۔ دو

ڈھائی منٹ کی انتھک محنت کے بعد سارے بچے سیڑھیاں چڑھ کر ماں کے پاس پہنچ چکے تھے اور اب بچّے اپنے بچوں کو ایک جھرمٹ کی صورت لیے منزل کی جانب چل پڑی تھی۔ ویڈیو کلپ ختم ہوا۔ آسیہ بیگم کی محویت ٹوٹی تو وہ آگے آئیں 'اساور کی ان کی طرف پشت تھی۔ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر وہ آگے ہوئیں تو دل دکھ سے بھر گیا۔ اساور کی قسمت میں اب صرف رونا ہی رہ گیا تھا شاید۔ لیکن اساور کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تھا۔ کوئی نئی امید' کوئی بے دار ہوتا حوصلہ' کوئی عزم۔ آسیہ بیگم کو قدرے ڈھارس ہوئی۔ اور پھر جب اساور کے مسئلے پر لوگوں کے تبادلہ خیال میں "تقریباً" خاتمہ ہو گیا' اڑتی دھول بیٹھنے لگی' غم کی موجیں تھمنے لگیں تب سعیدہ بیگم نے ان کے گھر جانے کا قصد کیا۔ آسیہ بیگم نے کئی بار سوچا اور نجم صاحب سے ڈسکس بھی کیا تھا کہ سعیدہ افسوس کے لیے نہیں آئی تھیں۔ لوگوں کی آمدورفت اور ہمدردی کی آڑ میں طعنوں تشنوں سے مغموم اور کبیدہ خاطر ہونے کے باوجود سعیدہ کا نہ آنا انہیں چبھ رہا تھا۔ دل میں کہیں یہ خیال بھی ابھرتا تھا کہ عمر کے رشتے سے بھی انہوں نے انکار کیا تھا شاید اس لیے سعیدہ اب دل میں خوش ہوں گی اور آئیں گی بھی نہیں۔ لیکن کہیں نہ کہیں دل کے کسی کونے سے اپنی ہی سوچ کی تردید بھی ابھرتی تھی۔ عمر کے رشتے سے انکار کے باوجود سعیدہ کے خلوص و محبت میں ذرہ بھر بھی کمی نہ آئی تھی۔ پھر اب وہ کیسے بدگمانی پال لیتیں۔ لیکن دل ہی تو ہے۔

پھر اس خوب صورت سی شام جب اساور عرصے بعد اچھا سا ڈریس پہن کر کچن میں آئی اور اپنا فیورٹ کیک بیک کیا' بہت محنت سے اس پر آئسنگ کی اور بریرہ نے چائے بنائی' یہ سب لوازمات لیے وہ لوگ لاؤنج میں آکر بیٹھے ہی تھے جب سعیدہ کی آمد ہوئی۔ ان کو آتا دیکھ کر وہ سب ایک بار پھر ایک نئے تفصیلی انٹرویو کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے جذباتی اور ذہنی طور پر تناؤ کا شکار ہوئے تھے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد اس تناؤ کا شائبہ بھی محسوس نہ ہو رہا تھا۔ اور وجہ وہی سعیدہ کا ازلی نرم اور پر خلوص انداز۔ انہوں نے آتے ہی جوش سے پوچھا۔

"ارے... اتنا خوب صورت کیک۔ یقیناً" میری بیٹی نے بنایا ہو گا۔ ہے نا۔" ان کے محبت بھرے انداز پر اساور کھل کر مسکرا دی۔

"جی پھپھو۔ اور دیکھئے آپ کی قسمت کہ آپ اسے چکھنے خود آ گئیں۔ شاید اس لیے اس کیک کو بنانے کی خواہش مجھے کچن میں کھینچ لائی تھی کہ آج میری پیاری پھپھو آنے والی تھیں۔" اساور کی محبت سے کی گئی بات پر سعیدہ نے اسے گلے لگا لیا اور دیر تک گلے لگائے اسے پیار کرتی رہیں۔ ان کے اس پیار میں ہی ان کا دکھ اور اس کو دی جانے والی تسلی ایک تھپکی اور نرم گرم آغوش کی صورت موجود تھی۔ انہوں نے بنا ایک لفظ ادا کیے اس حادثے کا خاموش افسوس بھی کر لیا تھا اور کسی کو تکلیف بھی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ان کا یہی طور طریقہ تھا جس کی بنا پر اساور کا دل ان کی طرف کھنچتا تھا۔ وہ وہیں صوفے پہ ساور کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھ گئیں اور ہولے ہولے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلاتی باتیں کرنے لگیں۔ روٹین کی گپ شپ' چھوٹی حمرہ کی شرارتیں اور سمجھ داریاں' پھر دانش کی جاب کا پوچھتی رہیں' بریرہ کی پڑھائی کے حوالے سے سوال کیے۔ سب ہی کچھ تو پوچھا تھا بس نہیں سوال کیا تو بریرہ کی رخصتی کا یا اساور کی طلاق کا۔ آج پہلی بار آسیہ بیگم کو سعیدہ سے اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے بصد اصرار انہیں ڈنر پہ روکا تا کہ وہ بھائی سے بھی مل سکیں۔ اس سے قبل انہوں نے کبھی سعیدہ سے ایسی محبت نہیں جتائی تھی' لیکن آج انہیں بھی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ سعیدہ کے طور طریقے گھٹن زدہ نہیں بلکہ گھٹن بھرے قفس میں روزن جیسے تھے۔ اساور ان کی گود میں سر رکھے سکون سے آنکھیں موندے لیٹی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلا سکون و اطمینان آسیہ بیگم کو ایک نئی

خلش میں مبتلا کر گیا۔ کیا تھا جو وہ نام نہاد ماڈرن ازم' نمودو نمائش اور مغرب کی اندھی تقلید میں غرق ہو کر سعیدہ کو انکار نہ کرتیں۔ لیکن اب۔ اب پچھتائے کیا ہووت...... وہ کیسے اپنے منہ سے کہہ دیتیں۔ وہ تو نجم صاحب سے بھی نہ کہہ سکتی تھیں کیونکہ اس رشتے پہ وہ اتنے مخالف نہ تھے۔ لیکن اب...... اب صرف اور صرف پچھتاوے تھے۔

☼ ☼ ☼

انسان پیسے کے پیچھے کتے کی طرح بھاگتا ہے' جاہ وحشمت کے لیے رال ٹپکاتا پھرتا ہے' سرپٹ دوڑتا ہے اور ان انسانوں کے پیچھے دوڑتا ہے جن کے پاس یہ دونوں چیزیں ہوں۔ نہ اس کی دوڑ ختم ہوتی ہے نہ ہوس اور جب وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرتا ہے تب اسے وہ رب یاد آتا ہے جس نے اپنے لیے ایک قدم اٹھانے پہ دوڑ کر آنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ دنیا کے پیچھے تو جتنا بھاگو وہ اتنا ہی آپ سے دور بھاگتی ہے اور آپ اور تیز بھاگتے ہیں پھر جب آپ کو لگنے لگتا ہے کہ آپ نے دنیا کو پالیا...... تب ہی... ہاں تب ہی آپ آخری قدم پر لغزش کا شکار ہو کر ذلت سے اپنی جھولی بھر لیتے ہیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے مجھے چھوڑ کر دنیا میں جس چیز کے پیچھے بھاگو گے میں تمہیں اسی کے ہاتھوں ذلیل و خوار کردوں گا اور اگر ساری دنیا کو چھوڑ کر ہم اللہ کے پیچھے بھاگیں تو ایک توبہ...... بس ایک توبہ سچی پکی والی...... اور کروڑوں گناہ ایسے معدوم جیسے کوئی نومولود بچہ' بے گناہ معصوم۔ وہ تو قیامت کے روز بھی گناہ گار بندوں کی بخشش کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کے نامہ اعمال میں سے عذر نکلوائے گا۔

یہی تو فرق ہے رحمٰن اور انسان میں۔ اللہ پاک مہلت پہ مہلت دیتے ہیں' چانس پہ چانس' ہلکا سا جھٹکا دیتے ہیں۔ تہس نہس نہیں کرتے۔ اے میرے بندے سدھر جا...... حب الٰہی کی جھلک دکھاتے ہیں' انسان کی ہرجائی فطرت بھی دکھاتے ہیں۔ انسان سمجھے تو تب نا۔ اتنا اعلا دماغ پا کر بھی اے انسان تو سمجھتا کیوں

نہیں۔ اے انسان کیوں اتنا جاہل ہے تو۔

وہ دو متکبر و مغرور۔ اللہ کے عاجز بندے جو عاجزی بھلا بیٹھے تھے' اپنی چھوٹی سی سلطنت میں ننھے منے فرعون بنے بیٹھے تھے' دولت اور ہوس کی بنیاد پر انسانوں کو پرکھتے تھے' آج بلک بلک کر سسک سسک کر خانہ کعبہ کے سامنے سجدہ ریز اپنی لاڈلی بچی کی روٹھی خوشیوں کا سوال کر رہے تھے۔ انہیں آج بھی اپنی ہی غرض یاد تھی۔ وہ آج بھی اللہ کی خاطر نہیں آئے تھے' اپنی اولاد کی خاطر آئے تھے۔ اسی دولت اور جاہ و حشمت کی بنیاد پہ کیے جانے والے بریرہ کے رشتے سے انہیں ٹھوکر نہیں ملی تھی اس پہ شکر گزار تھے۔ وہ ایک ہی ٹھوکر پہ اوندھے منہ جا گرے تھے۔ انسان کس قدر خود غرض ہے۔ اللہ کے در پر کھڑا ہو کر بھی وہی دنیا مانگتا رہتا ہے جس سے ٹھوکریں کھا کر آیا ہوتا ہے۔ پھر بھی اللہ اسے نامراد نہیں رکھتا۔ وہ اس پر بھی بندے کو نوازتا ہے کہ دنیا کی خاطر ہی سہی پر میرے بندے نے مجھے مشکل کشا مانا۔ پندرہ روزہ عمرے میں وہ دنیا بھلائے عبادت میں مشغول رہے۔ جس اولاد کی خوشیاں مانگنے آئے تھے اسے بھی بھلائے کوئی کانٹیکٹ کیے بغیر وہ پندرہ دن نجم صاحب اور آسیہ بیگم نے مکمل اپنے رب کے سنگ گزارے تھے۔ اس غفور الرحیم نے ان کے دلوں کو کامل تیقن سے منور کر کے واپس بھیجا تھا۔

عمرے سے واپس آتے ہی انہوں نے بریرہ کے سسرال والوں کو انوائٹ کر کے رخصتی کی تاریخ دے دی تھی۔ اساور کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے وہ اب باقی معاملات سدھارنا چاہتے تھے۔ تیاریاں پھر سے شروع کی گئیں' گہما گہمی پھر سے جاگ اٹھی' لیکن فرق یہ تھا کہ آسیہ بیگم نے سب کچھ سادگی سے کرنے کی درخواست کی تھی جسے شاہانہ بیگم نے فراخدلی سے قبول کر لیا تھا۔ اساور نے خود کو بہت جلد سنبھال کر اپنے اعصاب کی مضبوطی کا سب کو قائل کر لیا تھا۔ بریرہ اس کے دکھ اور اپنی پہلے رخصتی ہونے پر قدرے بے چین تھی' لیکن باقی سب کا رویہ نارمل ہی رہا۔

☆ ☆ ☆

اس نے تحمل سے اپنی ماں کی ساری بات سنی تھی اور ان کی التجا بھری درخواست مکمل ہونے کے بعد مکمل سکون کے ساتھ چند جملے کہے تھے جنہیں سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئی تھیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔" ان کی حیرت پر وہ ہنسا تھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ وہ چڑ گئیں۔

"میں سنجیدہ ہوں۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"میری پیاری اور بھولی سی ماں میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں ساری عمر آپ سے اس شادی کے بارے میں کبھی اپنی خواہش کا اظہار نہ کرتا کیونکہ ایسا کر کے مجھے اپنا آپ خود غرض لگتا' لیکن شاید میری محبت سچی تھی اسی لیے اللہ نے خود ہی یہ خیال آپ کے دل میں ڈال دیا۔ اپنے جذبات میں آپ کو نہ بتاتا' لیکن آپ کے التجا بھرے انداز پہ مجھے خدشہ ہوا کہ آپ ساری عمر اس احساس جرم کا شکار رہیں گی کہ آپ نے مجھے مجبور کیا تھا۔ بس اسی لیے بتا دیا۔" آخر میں اس کا لہجہ شرارتی ہوا تو حیرت سے اسے دیکھتے دیکھتے انہوں نے زوردار دھموکا اس کے کندھے پہ جڑ دیا۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔

"ماں سے مخولیاں۔ شرم تو نہ آئی ایسے محبت کا اظہار کرتے ہوئے۔" وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"اچھا اب پرے ہٹو۔" انہوں نے اسے دھکیلا تو وہ پھر سے ان کے آگے آ گیا اور ہاتھ جوڑ دیے۔

"اب ناراض تو نہ ہونا نا' میری جان سے پیاری ماں۔" وہ مسکرا دیں۔

"اچھا اب مجھے جانے بھی دو۔ بریرہ کی رخصتی کی ڈیٹ فکس ہو چکی ہے' مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہو گا تاکہ کارڈز میں اساور اور تمہارا نام بھی شامل ہو جائے۔ ورنہ بیٹھے رہنا۔" انہوں نے دھمکی بھرا انداز اپنایا تو وہ بھی ڈرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا اور ہاتھ پکڑ کر انہیں کمرے سے باہر نکالنے لگا۔

"اوہ نہیں امی پلیز آپ جائیے جلدی۔"

"ہاں ہاں ابھی تمہاری من چاہی بیوی گھر آئی نہیں اور تم مجھے گھر سے نکالنے لگے ہو۔ توبہ توبہ۔ قرب قیامت۔" انہوں نے جاہل عورتوں کے انداز میں گال پیٹے تو وہ پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"امی واویلا واپس آکر کیجیے گا۔ میں یہیں بیٹھا ہوں کہیں نہیں جاؤں گا آپ کی واپسی تک۔"

"ہاں تم ابھی سے نکمے گھٹو زن مرید بن کر بیوی کے گھٹنے سے لگے رہنے کی پریکٹس کرو۔" مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

☆ ☆ ☆

اپنی خاطر جاگے ہو سوئے ہو
اپنی خاطر ہنسے ہو روئے ہو
کس لیے آج کھوئے کھوئے ہو
تم نے آنسو بہت بہے اپنے
تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

گرم گرم آنسو اس کے چہرے کو نم سی تپش دیتے لڑھک لڑھک کر اس کی گود میں جمع ہوتے جا رہے تھے کثافتیں دھل رہی تھیں، زنگ دھل رہے تھے، دل کے کاسے پر نئی نکور قلعی چڑھنے لگی تھی، محبت کی برسات سے دل میں ساکت مردہ پڑے جذبے بھیگ کر بیدار ہوتے جا رہے تھے۔

اب مجھے اپنے درد سہنے دو
دل کی ہر بات دل سے کہنے دو
میری بانہوں میں خود کو بہنے دو
مدتوں زخم خود سہے اپنے
تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

دل پر تواتر سے گرنے والے آنسو اس پرانے زنگ آلود نام کو رگڑ رگڑ کر دھو رہے تھے، کھرچ کھرچ کر مٹا رہے تھے اور آنسوؤں کے بعد کھلنے والی مسکان نے اس نئے نام کو اس کے دل میں گلابوں کے بیچوں بیچ سجانا تھا۔ اس کے اندر دل کے اونچے مسند پر کلیاں کھلا کر ایک سیج سجائی تھی اور اس سیج پر اس کے سنگ اس مسیحا کو بٹھانا تھا جو اس کے زخموں پر کچی کلیوں کے پھاہے رکھنے آگیا تھا۔ شہزادی کے جسم میں چبھی ناقدری کی سوئیاں نکال کر محبتوں اور چاہتوں کے دیپ روشن کرنے والا شہزادہ آگیا تھا۔

حسن ہی حسن ہو ذہانت ہو
عاشقی ہوں میں، تم محبت ہو
تم میری بس میری امانت ہو
جی لیے جس قدر جیے اپنے
تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

کتنا واضح فرق تھا... فائیو اسٹار ہوٹل کے خوب صورت ترین ہال کی اس دلفریب اور عالیشان تقریب میں ہونے والے نکاح اور یہاں اس کے اپنے جنت نظیر گھر میں موجود اس کے اپنے بیڈ روم میں بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ہونے والے نکاح میں۔ وہاں وہ عالیشان پیراہن میں شہزادیوں کی مانند سجی تھی اور یہاں وہ سادہ، مگر خوب صورت اور پروقار گھریلو لڑکی کے روپ میں سجی

تھی۔ وہاں اس کا حسن دنیا جہاں کے مردوں نے دیکھا اور سراہا تھا اور یہاں۔۔۔ صرف وہی ایک شخص ابھی ابھی یہاں اس سے مل کر نکلا تھا جو اب ساری زندگی کا ہم سفر تھا' جو اس کے حسن و عزت کا محافظ تھا اور وہی اصل محافظ تھا۔

رہتے ہو رنج و غم کے گھیروں میں
دکھ کے آسیب کے بسیروں میں
کیسے چھوڑوں تمہیں اندھیروں میں
تم کو دے دوں گا سب دیے اپنے
تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

اس بے انتہا خوب صورت کارڈ پہ اس کی بے حد خوب صورت رائٹنگ میں لکھی یہ نظم پڑھتے ہوئے اس کی محبت کی شدت اور سچائی کھڑے کھڑے اساور کو اپنا اسیر کر گئی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا جہاں سے وہ ابھی ابھی اسے یہ کارڈ اور ایک ادھ کھلی گلاب کی کلی پکڑا کر نکلا تھا۔ اس کا دل محبت اور احترام کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

پورا ہال اس قدر لاتعداد سرخ گلابوں سے سجا ہوا تھا کہ ہر شخص مہکا جا رہا تھا۔ آسیہ اور نجم صاحب کی دونوں بیٹیوں کو اکٹھا رخصت کرنے کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ اسٹیج پر دو کپلز پوری شان سے براجمان تھے۔ بریرہ اور اسفندیار اور۔۔۔ جی ہاں بالکل اساور اور عمر شہزاد احمد۔ خاموش محبت کا فاتح سکندر۔ دونوں بہنیں سرخ و سفید امتزاج سے بنے لہنگوں میں ملبوس مسرتوں سے لبریز تھیں۔ آسیہ بیگم اور نجم صاحب کی پلکیں آج بھی نم تھیں۔ سعیدہ بیگم اور ان کی بیٹیاں خوشی سے سرشار۔ بریرہ اور اساور پر سکون و مطمئن' پرانے رشتے نئے خوب صورت رشتوں میں ڈھل کر اذیتوں کی دھول پر پانی چھڑک رہے تھے۔ رنگ بھری یہ رات 'نئی' شفاف اور اجلی سوچوں کے طلوع کا منظر پیش کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اس کی محبتوں کی شدتوں پر حیرت زدہ تھی تو مخفی رکھنے پر شکوہ کناں بھی تھی۔ بے یقین بھی تھی اور نازاں بھی۔

"اتنی محبت تھی تو کبھی ظاہر کیوں نہ کیا' کوشش کیوں نہ کی۔" اس کا شکوہ مچل کر لبوں پہ آگیا تو عمر سو جان سے فدا ہوا۔ اس کے مہندی اور چوڑیوں بھرے ہاتھ تھام کر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"مجھے میرے رب نے نوازا ہے جو تم مجھے ملی۔ ورنہ خود سے یہ خواہش اگر میں کرتا تو اپنی نظروں میں گر جاتا' مجھے یہ اقدام خود غرضانہ لگتا۔ میں اپنی محبت کی سچائی کو آزمانا چاہتا تھا۔ میرے رب نے مجھے مایوس نہیں کیا۔" اس کی آنکھوں میں سمندر تھا' جذب کا' خلوص کا' محبت کا۔۔۔ اور اس سب سے بڑھ کر۔۔۔ عزت کا۔ جس نے عزت کرنا سیکھ لیا وہ محبت کرنا بھی سیکھ جاتا ہے اساور جذبوں کی یورش سے گنگ تھی۔ خدا نے اس قدر اذیتوں کے بعد ایسا ثمر دینا تھا' یہ اسے پہلے پتا ہوتا تو کبھی شکوہ نہ کرتی۔ اسے اپنے رب پہ بے انتہا پیار آیا۔

آپ کے قرب سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا
زندگی اتنی دل آویز بھی ہو سکتی ہے

اس کے سرگوشی نما خوب صورت سے اظہار نے عمر کو دیوانہ کر دیا۔ اساور کا دل عمر کی محبت پا کے دمک اٹھا تھا۔ عمر کا دل اساور کو پا کے سنور گیا تھا۔ وہ دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لیے تھے۔

ہر دن ہے محبت کا ہر رات محبت کی
ہم اہل محبت ہیں ہر بات محبت کی
ہم درد کے ماروں کا اتنا سا حوالہ ہے
تنہائی ہے گھر اپنا اور ذات محبت کی
سینے میں اترتے ہیں الفاظ محبت کے
آنکھوں سے برستی ہے برسات محبت کی

☆ ☆